www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

November 2007 ● No. 372

دوسروں کی شکایت صرف اپنی نااہلی کا اعلان ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدّین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
website: www.alrisala.org
email: skhan@vsnl.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 100,
Two years Rs. 200,
Three years Rs. 250,
Abroad: One year $10 (Air Mail)

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

نومبر 2007

اسماءِ حسنیٰ اور اسمِ اعظم

اسماءِ حسنٰی اور اسمِ اعظم

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: **ولله الأسماء الحُسنىٰ (الأعراف: 180)** یعنی اللہ ہی کے لیے ہیں اچھے نام (best names)۔ یہ بات قرآن میں چار مقامات پر کہی گئی ہے (**الأعراف: 180؛ الإسراء: 110؛ طٰه: 8؛ الحشر: 24**) یہاں نام سے مراد نام نہیں ہیں، بلکہ صفات (attributes) ہیں، یعنی تمام اچھی صفتیں خدا ہی کے لیے ہیں۔

اسماءِ حسنیٰ کی تعدا کیا ہے، ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اسماءِ حسنیٰ کی تعداد ننّا وے ہے۔ بعض علمانے اسماءِ حسنیٰ کی تعداد میں اضافہ کیا ہے، چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ اسماءِ حسنیٰ کی تعداد ایک ہزار تک ہے (تفسیر ابن کثیر، جلد2، صفحہ 269)۔ مگر اِس معاملے میں تعداد کی حیثیت اضافی ہے۔ یہ تعداد دراصل، انسانی فرہنگ یا مجموعۂ الفاظ (vocabulary) کے اعتبار سے ہے۔ انسانی زبان کے الفاظ محدود ہوتے ہیں، لیکن خدا ایک لامحدود ہستی ہے، اِس لیے خدا کی صفات بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے لامحدود ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کی ننانوے تعداد گویا کہ خدا کی نمائندہ صفات ہیں۔ اس اعتبار سے خدا کی بقیہ صفات بھی براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اِنھیں بنیادی صفات میں شامل ہیں۔

خدا کے ننانوے نام

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح البخاری کے الفاظ یہ ہیں:

عن أبی هریرة أن رسول الله صلى الله علیه وسلم قال: إنّ لِلّٰهِ تسعة وتسعین إسماً، مأة إلّا واحداً۔ مَن أحصاها دخل الجنة (صحیح البخاری، باب للّٰه مأة إسم غیرَ واحدة، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدّعاء) یعنی حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا— اللہ کے ننانوے نام ہیں، سَو میں ایک کم۔ جس شخص نے اُن کا اِحصا کیا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اِس حدیثِ رسول میں ’اِحصاء‘ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِحصا کا مطلب مجرد شمار کرنا نہیں ہے،

بلکہ اس سے مراد اسماءِ حسنیٰ کا عارفانہ ادراک ہے۔ عربی کے مشہور لغت 'المعجم الوسيط' میں اِس کو اِن لفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **أحصى الشيئ: أي عرف قَدرَہ**۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہاں 'احصاء' سے مراد اِحصاءِ شعوری ہے، نہ کہ احصاءِ لسانی، یعنی اسماءِ حسنیٰ کی معرفت۔

اللہ کے یہ نام دراصل اللہ کی صفات کے مختلف پہلو ہیں۔ آدمی خدا پر اور اس کی تخلیقات پر غور کرتا ہے تو خدا کی خدائی کے مختلف پہلو اس کے سامنے آتے ہیں۔ اِنھیں پہلوؤں کا شعوری ادراک ہونا، اُن کا احصا کرنا ہے۔ اور جو لوگ اِس اعتبار سے خدا کی معرفت حاصل کریں، وہ بلاشبہہ جنت میں جائیں گے، کیوں کہ جنت دراصل معرفتِ خداوندی کی قیمت ہے۔

حدیث میں ننانوے کا لفظ محض اعتباری ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بے شمار نام ہیں۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بعض علما سے نقل کیا ہے کہ: **إنّ لِلّٰہ خمسة آلاف إسم**۔ یعنی اللہ کے پانچ ہزار نام ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 19)، مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بے شمار نام ہیں۔

حدیث میں اسماءِ حسنیٰ کی تعداد ننانوے بتائی گئی ہے۔ قرآن کا مطالعہ کرکے علما نے یہ تمام اسماءِ حسنیٰ نام بہ نام دریافت کیے ہیں، لیکن یہ نام خدا کے لامتناہی کمالات کی مطلق گنتی کو نہیں بتاتے۔ یہ تمام نام دراصل انسان کی نسبت سے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر جب عبدیت جاگتی ہے اور شعورِ خداوندی اُس کے اندر بیدار ہوتا ہے تو فطری طور پر اُس کے اندر مختلف قسم کی ربّانی کیفیات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ دراصل، انھیں ربّانی کیفیات کے لیے موزوں الفاظ (appropriate words) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مثلاً انسان اپنے وجود پر غور کرتا ہے، جو کہ احسنِ تقویم کا نمونہ ہے (**التّین: 4**)۔ وہ نیچر پر غور کرتا ہے، جس میں ہر چیز حیرت انگیز طور پر اپنے آخری ماڈل پر ہے۔ وہ زمین اور آسمان پر غور کرتا ہے، جس میں کہیں کوئی خلل یا نقص موجود نہیں (**الملك: 3**)۔ یہ سوچ اور یہ مشاہدہ آدمی کے اندر ایک پُرتموّج تجربہ (thrilling experience) پیدا کرتا ہے۔ اُس وقت آدمی بے اختیارانہ طور پر یہ چاہنے لگتا ہے کہ اُس کے پاس ایسے موزوں الفاظ ہوں، جن کے ذریعے وہ اِن لطیف احساسات کا اظہار

(express) کرسکے۔ اُس وقت، قرآن اُس کی عین طلب کے مطابق، اُس کو یہ الفاظ فراہم کردیتا ہے: **فتبارک الله أحسن الخالقین (المؤمنون: 14)**

خدا کے نام میں الحاد

خدائی صفات کی یہ تعداد دراصل 'الحاد' کے مقابلے میں بتائی گئی ہے، جیسا کہ خود قرآن میں آیا ہے (الأعراف: 180)۔ الحاد کے معنیٰ انحراف (deviation) کے ہیں۔ یہ الحاد یا انحراف سب سے زیادہ فلسفے میں کیا گیا ہے۔ فلسفے میں خدا کا تصور ایک بے صفاتی شخصیت (attributeless being) کے طور پر کیا گیا ہے۔ اِسی فلسفیانہ تصور کے زیرِ اثر، ہندوازم میں 'نراکار خدا' (formless god) کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ مشہور جرمن فلسفی فریڈرِک ہیگل (Friedrich Hegel) نے اِس کو رُوحِ عالَم (world spirit) کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایک اور فلسفی نے اس کو 'مجرد تصور' (abstract idea) قرار دیا ہے۔

یہ فلسفیانہ تصور، بعض بڑے مذاہب کی اعتقادیات میں بھی داخل ہوگیا۔ اِس تصور کے مطابق، خدا کی کوئی مستقل اور علاحدہ شخصیت نہیں۔ وہ ایک بے شخصیت اور بے صفات ہستی ہے، یعنی زمین کی قوتِ کشش (gravity) یا کاسمک ریز (cosmic rays) کی طرح۔ قرآن میں اسماءِ حسنیٰ کا بیان دراصل اِسی فلسفیانہ گُم راہی کی تردید کے طور پر آیا ہے، نہ کہ اسماءِ الٰہی کی متعین تعداد کو بتانے کے لیے۔

فلسفے میں یا اُس سے متاثر مذاہب میں خدا کا تصور خالق کے طور پر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اِس تصور کے مطابق، تخلیق کے تمام مظاہر خود خدا کا اپنا ظہور ہیں۔ یہ بلاشبہہ ایک مجرد فلسفیانہ قیاس ہے۔ یہ ایک کھُلی ہوئی بات ہے کہ کائنات میں متنوّع مظاہر پائے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ صرف ایک بے بنیاد قیاس ہے کہ ایک ایسا مفروضہ خدا، جو ہر قسم کی صفات سے کُلّی طور پر خالی ہو، وہ متنوّع تخلیقات کی صورت میں ظاہر ہوجائے۔ اِس قسم کے تضادات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا کا مذکورہ تصور محض ایک فلسفیانہ قیاس ہے، اُس کے حق میں کوئی علمی بنیاد موجود نہیں۔

سائنسی مطالعہ

موجودہ زمانے میں فطرت کے سائنسی مطالعے کے بعد خدا کے متعلق یہ فلسفیانہ تصور عملاً بے اصل

ثابت ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانے میں سائنسی مطالعے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ کائنات کے اندر کمال درجے میں معنویت (meaning) پائی جاتی ہے۔ اِس قسم کی معنویت اِس کے بغیر ممکن نہیں کہ اُس کا خالق ایک ذہن (mind) ہو۔ چناں چہ سائنس میں خدا کا نام نہ لیتے ہوئے یہ مان لیا گیا ہے کہ کائنات کو وجود میں لانے والا ایک ذہین نقّاش (intelligent designer) ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ماہ نامہ الرسالہ، ستمبر 2007، سائنس اور الٰہیات)۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک ایسے خدا کا تصور پیدائشی طور پر موجود ہے، جو متنوع صفات کا حامل ہو۔ اِس طرح سائنسی مطالعے میں کائنات اگرچہ آخری طور پر ایک ہی یونٹ (atom) کا مختلف ظہور ہے، لیکن یہ ایٹم حیرت انگیز طور پر مختلف اور متضاد قسم کی بامعنیٰ چیزوں کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ انسانی فطرت اور خارجی کائنات، دونوں اِس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کائنات میں ایک طرف بہت زیادہ اختلاف اور تنوع ہے اور دوسری طرف کائنات کے مختلف اجزا میں غیر معمولی ہم آہنگی (harmony) پائی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں انسان کا ذہن یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا کی متنوع حیثیتوں کا تصور کرسکے۔ قرآن میں مذکور اسماءِ حسنیٰ اِسی سوال کا جواب ہیں۔

خدا کا فزیکل ماڈل

خدا کا عقیدہ انسان کے اندر ہمیشہ سے پایا گیا ہے۔ اینتھراپالوجی (anthropology) کے تحت جو مطالعہ کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسانی سماج کسی نہ کسی اعتبار سے خدا کو مانتا رہا ہے۔ خدا کا عقیدہ فلسفیوں کے یہاں بھی پایا گیا ہے اور اہلِ مذاہب کے یہاں بھی۔ لیکن فلسفہ اور مذہب دونوں میں خدا کا عقیدہ ایک بے صفات خدا (attributeless God) کی حیثیت سے پایا جاتا رہا ہے، یعنی کاسمک ریز (cosmic rays) یا زمین کی قوتِ کشش (gravity) کی مانند۔

لیکن مجرد خدا (abstract God) انسان کی ذہنی گرفت میں نہیں آتا۔ انسان خدا کا ایک ایسا ماڈل بنانا چاہتا ہے، جس میں وہ خدا کو صفات کی اصطلاحوں (in term of attributes) میں قابلِ فہم

بنا سکے۔ انسان کی یہی ضرورت ہے جس کے غیر فطری اظہار کے نتیجے میں بت وجود میں آئے۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ الفاظ یا ناموں کے ذریعے کسی حقیقت کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ اس طرح مختلف بُت، انسان کو مختلف الفاظ یا نام دے دیتے ہیں جن کے ذریعے وہ بزعمِ خود ایک ماڈل کے روپ میں خدا کا ادراک کرتا ہے۔ انسان نے اپنی اِسی فطری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے غلط طور پر بت بنائے اوران کی پرستش شروع کردی۔

لیکن بتوں کی شکل میں خدا کا ماڈل بنانا، ایک بے بنیاد قیاس ہے، کیوں کہ خدا کو بتوں کا روپ دینا ایک لامحدود ہستی کو محدود کا روپ دینا ہے، یہ خدا کا ایک بگڑا ہوا فارم ہے۔ یہ خدا کے نام پر خدا کی نفی کے ہم معنی ہے۔

بت چوں کہ مٹی یا پتھر کے ہوتے ہیں اور انسان خود ان بتوں کو بناتا ہے۔ خدا کو بتوں کی شکل دینے کے باوجود ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہ صرف مٹی اور پتھر ہیں، اُن کے اندر کوئی ذاتی طاقت نہیں۔ اس لیے بتوں کی سطح پر خدا پرستی عملاً صرف ایک بے روح رسم بن جاتی ہے۔ انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ بتوں سے قلبی ربط قائم کرسکے۔ اس لیے فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ رسمی اعمال، خدا پرستی کی جگہ لے لیتے ہیں۔ آدمی خدا پرستی کے نام پر کچھ بے روح رسموں، مثلاً پھول چڑھانے یا نذر و نیاز دینے کو خدا پرستی کے لیے کافی سمجھ لیتا ہے۔

مزید یہ کہ آدمی خدا کے نام پر بتوں سے قریب ہوتا ہے، لیکن بتوں کی طرف سے جوابی طور پر اس کو کوئی انسپریشن (inspiration) نہیں ملتا، انسان داخلی طور پر اپنے لیے کوئی روحانی غذا نہیں پاتا، اِس لیے بتوں کا کلچر محض ایک بے روح تعلق بن کر رہ جاتا ہے۔ بتوں سے قربت کے باوجود انسان کو اتنی بھی روحانی کیفیت نہیں ملتی جتنا کہ ایک باپ یا ماں کو اپنے بچے سے مل کر حاصل ہوتی ہے۔

انسان ایک باروح شخصیت ہے۔ اپنی اِس فطرت کے اعتبار سے اس کو ایک باروح خدا درکار ہے۔ پتھر کی مورتی سے اس قسم کا روحانی تعلق قائم ہونا ممکن نہیں۔ روحانی تعلق دوطرفہ تعلق کا نام ہے۔ ہمارے اندر کیفیات ہوں، لیکن دوسری طرف سے اس کا جواب نہ ملے تو اِس قسم کا یک طرفہ تعلق صرف

اوپری یا غیر فطری تعلق ہوگا، وہ انسان کی زندگی میں کوئی حقیقی درجہ حاصل نہیں کرسکتا۔

یہ واقعہ ایک اور شدید تر خرابی پیدا کرتا ہے، وہ یہ کہ بت کلچر آخر میں جھوٹ کلچر یا ظاہرداری کلچر بن کر رہ جاتا ہے۔ بتوں کے اندر خدائی اوصاف ثابت کرنے کے لیے فرضی کہانیاں بنائی جاتی ہیں اور ان کو خوب شہرت دی جاتی ہے، تاکہ بتوں کا جو فائدہ حقیقی طور پر نہیں ملا، اُن کے بارے میں لوگوں کو یہ فرضی تاثر دیا جائے کہ وہ حاصل ہوئے، یا وہ حاصل ہوسکتے ہیں۔

بت پرستی کا یہی ظاہرہ (phenomenon) قبر پرستی کی دنیا میں بھی نظر آتا ہے۔ قبر پرست لوگ صاحبِ قبر کے نام پر انتہائی بے بنیاد قسم کی فرضی کہانیاں وضع کرتے ہیں۔ وہ جھوٹے خوابوں کا طلسم بناتے ہیں اور پھر ان فرضی کہانیوں اور فرضی خوابوں کو اس طرح پھیلاتے ہیں جیسے کہ وہ سچ مچ واقعہ ہوں۔ اس طرح اَصنام کلچر اور درگاہ کلچر انسان کو دیوالیہ پن کی حد تک اعلیٰ اخلاق سے دور کر دیتا ہے۔

انسان عین اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے ایک جذباتی وجود ہے۔ جذبات کا تفرق (diversification) ممکن نہیں۔ انسان فطری طور پر اپنے جذبات کا کوئی ایک مرکز چاہتا ہے۔ جذبات کا کئی مرکز ہونا ایک غیر فطری بات ہے جو عملاً ممکن نہیں۔ بت پرستی اِس معاملے میں بھی انسانی نفسیات سے ٹکرا جاتی ہے۔ فطری طور پر انسان کسی ایک ہی چیز سے جذباتی تعلق قائم کرسکتا ہے۔ بت پرستی کے مذہب میں چوں کہ یہ مراکز متعدد ہوجاتے ہیں، اِس لیے اس کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقی خدا پرستی سرے سے ختم ہوجاتی ہے۔ خدا پرستی کے نام پر کچھ بے روح مظاہر باقی رہتے ہیں، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

ایک مثال

کسی ماں کا بچہ اپنی ماں سے دور ہو تو اُس کی ماں ایسا نہیں کرے گی کہ وہ مٹی یا پتھر کے ذریعے اپنے بچے کی مورتی بنائے اور اُس پر صبح وشام پھول چڑھائے، یا وہ اپنے بچے کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے اُس کی کئی مورتیاں بنائے اور اِن مورتیوں کے آگے وہ مختلف رسمیں ادا کرے۔ اگر کوئی ماں

ایسا کرے تو اِس طرح اُس کو اُس کے جذبات کی تسکین نہیں ملے گی۔ اپنے بچے کے ساتھ اس کا کوئی تعلق قائم نہیں ہوگا۔ اگر کوئی ماں ایسا کرے تو اُس کے لیے اپنے بچے سے تعلق محض ایک ظاہر داری کی رسم بن جائے گی۔ اِس طرح کی ظاہر دارانہ رسوم کسی بھی درجے میں ماں اور بچے کے درمیان لطیف تعلق کا بدل نہیں بن سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی ماں نے ایسا نہیں کیا۔ ماں اپنے دور کے بیٹے سے ہمیشہ تصوراتی تعلق قائم کرتی ہے، وہ اس کی مورتی بنا کر اس کے ذریعے اپنے بچے سے تعلق قائم کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔

اِس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ خدا کے نام پر خدا کے بُت بنانا کتنا زیادہ بے اصل بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ خدا کے نام پر بتوں کی پوجا کرتے ہیں، یا جو لوگ خدا کے نام پر قبروں اور درگاہوں کے آگے جھکتے ہیں اور پھول اور چادر چڑھاتے ہیں، وہ خدا کے ساتھ حقیقی تعلق سے بالکل محروم ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ کچھ ظاہری رسوم میں جیتے رہتے ہیں، خدا کے ساتھ تعلق کی لطیف حقیقت سے وہ کبھی آشنا نہیں ہوتے۔ خدا اُن کے لیے محض ایک بے روح لفظ ہوتا ہے، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اسماءِ حسنیٰ: خدا کا تصوراتی ماڈل

اسماءِ حسنیٰ کا معاملہ اِس سے بالکل مختلف ہے۔ اسماءِ حسنی کے ذریعے آدمی اِس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں خدا کا تصور اپنے ذہن میں لائے، وہ حقیقی طور پر خدا سے مربوط ہو سکے۔

بت پرستی کے مذہب میں انسان، خدا کے فزیکل ماڈل (physical model) بناتا ہے۔ اِس قسم کے ماڈل بنانا ایک سنگین انحراف ہے، وہ خدا پرستانہ کلچر کو ایک بے روح رسم بنا کر رکھ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اَصنام کلچر یا درگاہ کلچر خدا کی خدائی کا کم تر اندازہ (underestimation) ہے۔ بت پرستی کے کلچر میں یا قبر پرستی کے کلچر میں اعلیٰ خدائی اخلاقیات کبھی پرورش نہیں پا سکتے۔

اسماءِ حسنیٰ گویا کہ اِسی غلطی کی تصحیح ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے انسان کو خدا کا تصوراتی ماڈل (conceptual model) مل جاتا ہے۔ اور بلاشبہہ خدا کا تصوراتی ماڈل ہی صحیح ماڈل ہے۔ اسماءِ حسنیٰ

کی شکل میں آدمی اُن صحیح الفاظ کو پالیتا ہے جن کے ذریعے وہ خدا سے تصوراتی ربط قائم کرسکے۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے خدا سے جو تعلق قائم ہوتا ہے، وہ ایک زندہ اور معلوم تعلق ہوتا ہے۔

مثلاً انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ خدا ایک ہو اور وہ زندہ اور قائم خدا ہو۔ اب جب وہ کہتا ہے کہ: اللّٰہ لا إلٰہ إلاّ ہو الحيُّ القیّوم (آلِ عمران: 2) تو وہ عین اپنی فطری مانگ کے مطابق، فوراً خدا کا ایک حقیقی ماڈل پالیتا ہے۔ اِس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان ایک زندہ تعلق قائم ہوجاتا ہے۔ اِس اعتبار سے اسماءِ حسنیٰ، خدا اور انسان کے درمیان تصوراتی ربط (contact at conceptual level) کا زندہ اور حقیقی ذریعہ ہیں۔ وہ انسان کی فطری تلاش کا ایک بھرپور جواب (complete response) ہیں۔

اسماءِ حسنیٰ، انسان کے لیے خدا کا مستند تعارف ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے انسان، خدا کی صفاتی شخصیت کا یقینی تصور اپنے ذہن میں لاسکتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ خدا کا وہ تصوراتی ماڈل ہے جو کسی انسانی قیاس پر قائم نہیں ہے، بلکہ وہ خود خدا کے الہامی علم پر قائم ہے۔ وہ اعتقادی بے یقینی میں بھٹکے ہوئے انسان کو یقین کا سرچشمہ عطا کرتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے انسان اُس صحیح فریم ورک کو پالیتا ہے جس کی روشنی میں وہ خدا کو اپنے لیے پوری طرح قابلِ فہم (understandable) بناسکے۔

اسماءِ حسنیٰ اور دیگر مذاہب

اسماءِ حسنیٰ کا مطالعہ تاریخی نقطۂ نظر سے کیا جائے تو ایک انوکھی چیز دریافت ہوگی، وہ یہ کہ اسماءِ حسنیٰ کا تصور (concept) اسلام کے سوا کسی اور موجودہ مذہب یا کسی اور موجودہ اعتقادی نظام میں نہیں پایا جاتا۔ یہ اسلام کی استثنائی صفت ہے کہ اُس کے اندر خدا کے بارے میں اسماءِ حسنیٰ کا تصور پایا جاتا ہے۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اگر آپ اسلام اور دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ بے حد سنگین بات ہے۔ چناں چہ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام کے سوا، دوسرے مذاہب میں انسان اور خدا کے درمیان گہرا تعلق سرے سے نہیں پایا جاتا۔ ہر دوسرے مذہب میں خدا

کی حیثیت صرف ایک علامتی ہستی (symbolic God) کی ہے، نہ کہ ایک حقیقی اور زندہ خدا کی۔

مثال کے طور پر یہودی مذہب کو لیجیے۔ یہودی اعتقادیات کا ماخذ بائبل (عہد نامہ قدیم) ہے۔ آپ اِس کتاب کا مطالعہ کریں تو اُس میں اسماءِ حسنیٰ کی نوعیت کا خداوندی تعارف موجود نہیں۔ ایک جگہ خدا کو بتاتے ہوئے، اُس کے بارے میں **''میں جو ہوں، سو میں ہوں''** کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سلسلے میں بائبل کے اصل الفاظ اس طرح ہیں:

تب موسیٰ نے خدا سے کہا: جب میں بنی اسرائیل کے پاس جا کر اُن کو کہوں کہ تمھارے باپ دادا کے خدا نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے اور وہ مجھے کہیں کہ اُس کا نام کیا ہے، تو میں اُن کو کیا بتاؤں۔ خدا نے موسیٰ سے کہا: میں جو ہوں، سو میں ہوں۔ سو تو، بنی اسرائیل سے یوں کہنا کہ میں جو ہوں نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے (خروج 14 ,13 :3)

اِسی طرح مسیحیت کا مذہبی ماخذ وہ کتاب ہے جس کو نیا عہد نامہ (بائبل) کہا جاتا ہے۔ اِس نیے عہد نامے میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیح جب صلیب پر چڑھائے گیے تو اُن کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: اِلوہی، اِلوہی، لما شبقتنی، یعنی اے میرے خدا، اے میرے خدا، تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا:

My God, my God, why have You forsaken me. (Mark, 15:34)

مسیحی چرچ کے عقیدے کے مطابق، حضرت مسیح کا سُولی پر چڑھ کر مصلوب ہونا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا، وہ مسیحی چرچ کے عقیدے کے مطابق، ایک خدائی منصوبے کے تحت پیش آیا۔ کفّارۂ مسیح کے عقیدہ (atonement) کے مطابق، خدا نے حضرت مسیح کو اِسی خاص مقصد کے لیے دنیا میں بھیجا تھا کہ وہ انسانی گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سُولی پر چڑھ جائیں، اور انھوں نے بخوشی ایسا کیا۔

مسیحی چرچ کے مبیّنہ عقیدے کے مطابق، خدا، تثلیث کا ایک حصہ ہے۔ مسیحی عقیدے کو ٹری نٹی (trinity) کے لفظ میں بیان کیا جاتا ہے، یعنی تین میں ایک اور ایک میں تین۔ اِس عقیدے کے مطابق، حضرت مسیح عام انسان نہیں تھے، بلکہ وہ خدا کا ایک حصہ تھے۔

ایسی حالت میں حضرت مسیح کا مذکورہ واقعہ، انسان کے لیے خدا کے معاملے میں یقین کا

سر چشمہ نہیں بن سکتا۔ اِس واقعے میں خدا خود بے بس ہو کر فریاد کررہا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو ایک متروک وجود سمجھتا ہے۔ اُس کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ اپنے آپ کو وقت کے حکم رانوں سے محفوظ رکھ سکے۔ ایسا خدا، دوسرے انسانوں کے لیے کس طرح اعتماد کا سر چشمہ بن سکتا ہے۔ انسان کو ایک ایسا خدا چاہیے جو اُس کے لیے اعتماد کا ذریعہ بن سکے، مگر مسیحیت، انسان کو ایک ایسے خدا کا تصور دیتی ہے جس میں خدا خود ہی بے بس دکھائی دے رہا ہے۔

اِس کے بعد اُن مذاہب کو لیجیے جن کو آرین مذاہب کہا جاتا ہے، یعنی ہندوازم، وغیرہ۔ اِن مذاہب میں پرسنل گاڈ (personal God) کا تصور موجود نہیں۔ اِن مذاہب میں اگر چہ خدا کا لفظ استعمال ہوتا ہے، مگر وہ صرف ایک علامتی لفظ ہوتا ہے، کیوں کہ اِن مذاہب میں عقیدۂ خدا کے تشخّص کے لیے کسی مستقل وجود کا کوئی تصور نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، آرین مذاہب میں خدا کو نِراکار (formless God) مانا جاتا ہے۔ اُن کے عقیدے کے مطابق، خدا 'نِرگُن' ہے، یعنی اُس کی کوئی صفت نہیں۔ ایسی حالت میں انسان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خدا کو ایک متعین ہستی کے طور پر اپنے ذہن میں لائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب میں خدا کی کوئی عبادت گاہ نہیں ہوتی۔ اُن کے یہاں یا بُتوں کی پرستش ہوتی ہے یا گُروؤں کی۔ کیوں کہ بت یا گُرو کا تشخص اُن کو ممکن دکھائی دیتا ہے، لیکن خدا کا تشخص اُن کے لیے قابلِ تصور نہیں ہوتا۔

عقیدۂ خدا اور اسماءِ حسنیٰ

خدا کا عقیدہ انسان کے لاشعور میں پیوست ہے۔ انسان اپنے فطری تقاضے کے تحت، اِس لاشعور کو شعور میں لانا چاہتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کا تصور انسان کی اِسی فطری ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کی حیثیت ایک فکری ماڈل کی ہے۔ یہ انسان کے اپنے فریم ورک کے مطابق، خدا کی ہستی کو اُس کے لیے قابل فہم بناتا ہے۔

مختلف مذاہب میں خدا کی ہستی کے مختلف ماڈل بتائے گیے ہیں۔ اِن میں سے دو ماڈل زیادہ معروف ہیں—— آکار ماڈل اور نِراکار ماڈل، مگر یہ دونوں انسانی فریم ورک کے اعتبار سے انسان کے

لیے قابلِ فہم ماڈل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ماڈل صرف کاغذ میں یا لفظوں میں پائے جاتے ہیں، وہ حقیقی معنوں میں انسانی شعور کا حصہ نہ بن سکے۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ دونوں ماڈل انسان کی نسبت سے ناقص ماڈل ہیں۔ آکار ماڈل، دوسرے لفظوں میں بُت کا ماڈل، ایک ایسے خدا کا تصور دیتا ہے جس کا بظاہر ایک فارم تو ہے، مگر وہ مکمل طور پر بے صفاتی (powerless) ہے۔ دوسری طرف، نراکار ماڈل بظاہر ایک طاقت ہے، مگر یہ طاقت، کششِ ارض (gravity) کی طرح بےصفاتی (attributeless) ہے۔ اِس طرح یہ دونوں ہی ماڈل، انسان کے معلوم فریم ورک کی نسبت سے مبہم ماڈل ہیں، وہ انسانی فطرت کا جواب فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ اسماءِ حسنٰی دراصل اِسی خلا کو پُر کرتے ہیں۔

اسماءِ حسنٰی: تلاشِ فطرت کا جواب

اسماءِ حسنٰی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے یہ تمام نام انسان کی نسبت سے خدا کا تعارف ہیں۔ انسان فطری طور پر اپنے سے ایک برتر ہستی کو چاہتا ہے۔ نفسیاتی مطالعے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر ایک متلاشی حیوان (seeking animal) ہے۔ انسان اپنے پورے وجود کے اعتبار سے ایک ذاتِ اعلیٰ کا متلاشی ہے، ایک ایسی اعلیٰ اور برتر ذات جو اُس کی کمیوں کی تلافی کرے، جو اُس کے جذبات اور احساسات کا مرکز ومحور بن سکے۔

اسماءِ حسنٰی دراصل اِسی سوال کا جواب ہیں۔ اسماءِ حسنٰی کا مطلب ہے، صفاتِ حسنٰی۔ خدا کی یہ صفات جو اسماءِ حسنٰی کے ذریعے بتائی گئی ہیں، وہ علی الاطلاق حیثیت سے خدائے برتر کا تعارف نہیں ہیں، بلکہ وہ انسان کی نسبت سے اُس کے مطلوب خدا کا تعارف ہیں۔ چناں چہ جب کوئی انسان اِن اسماءِ حسنٰی کو اُن کی پوری معنویت کے ساتھ جان لیتا ہے تو اچانک اُس کو دریافت ہوتا ہے کہ وہ جس خدائے برتر کی تلاش میں تھا، اُس کا تعارف اُس کو اسماءِ حسنٰی کی صورت میں مل گیا۔

مثال کے طور پر اسماءِ حسنٰی میں سے ایک نام 'الغنیّ' ہے۔ غنی کے لفظی معنیٰ بے نیاز کے ہیں، یعنی وہ ہستی جس کو دوسروں سے کچھ لینے کی ضرورت نہ ہو، لیکن اس کو یہ طاقت ہو کہ وہ دوسروں کی تمام

حاجتوں کو پورا کر سکے۔ یہ احساس ہر انسان کے اندر، شعوری یا غیر شعوری طور پر، چھپا ہوا ہے۔ اِس کے بعد جب انسان اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے یہ جانتا ہے کہ خدا کی ایک صفت اُس کا غنی ہونا ہے، تو فوراً ہی وہ جان لیتا ہے کہ وہ جس خدا کی تلاش میں تھا، اُس کو اُس نے یہاں دریافت کرلیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کی اِس آیت میں بتائی گئی ہے: یاایّها النّاس أنتم الفقراء إلى الله، والله هو الغنيُّ الحميد۔ یعنی اے لوگو، تم اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ تو بے نیاز ہے، تعریف والا ہے (فاطر : 15)۔

اِسی طرح ایک اور جذبہ، جو سارے انسانوں کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ ہر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جو رزق کی محتاج ہے۔ رزق سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں، جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ انسان ہر لمحہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بہت سی چیزوں کا ضرورت مند ہے — پانی غذا، ہوا، آکسیجن اور روشنی، وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں نہایت متناسب انداز میں اور نہایت وافر طور پر دنیا میں موجود ہیں۔

انسان فطری طور پر یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے جو اِن تمام ضروری چیزوں کو اُس کے لیے مہیّا کررہا ہے، بغیر اِس کے کہ وہ انسان سے اُس کی کوئی قیمت طلب کررہا ہو۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے اِس محسنِ اعلیٰ کے احسانات کا اعتراف کرے، وہ کامل اعتراف اور شکر کے جذبے سے اپنے آپ کو اُس کے آگے بچھادے۔ یہاں اسماءِ حسنیٰ میں اُس کو رہ نمائی ملتی ہے۔

خدا کے اِن ناموں میں سے ایک نام 'الرّزّاق' ہے۔ انسان جب خدا کو رزّاق کی حیثیت سے دریافت کرتا ہے تو اچانک اُس کو محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی طلب کا جواب پالیا۔ یہی وہ حقیقت ہے، جس کو قرآن کی اِس آیت میں بیان کیا گیا ہے: إنّ اللهَ هو الرّزّاق ذو القوّةِ المتين۔ یعنی بے شک، اللہ ہی رزق دینے والا، زور آور، زبردست ہے (الذّاريات: 58)

اِسی طرح ہر انسان کی ایک اور ضرورت ہے۔ موجودہ دنیا جس میں انسان کو زندگی گزارنا ہے، وہ اِس انداز سے بنی ہے کہ کوئی انسان اُس کے اندر معیاری انداز میں نہیں رہ سکتا۔ اِسی طرح انسان کے اندر بہت سی خواہشیں اور تمنائیں ہیں۔ اِن خواہشوں اور تمناؤں کے زیرِ اثر ہر آدمی بار بار غلطیاں

کر بیٹھتا ہے۔ اِن حالات میں ہر انسان یہ سوچتا ہے کہ کیسے وہ اپنی غلطیوں کے احساس سے اپنے آپ کو بچائے۔ کس طرح ایسا ہو کہ وہ اپنے آپ کو ایک پاکیزہ روح کا درجہ دے سکے۔ یہاں اسماءِ حسنیٰ میں وہ اپنے لیے تسکین کا سامان پالیتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، خدا کا ایک نام 'الغفور' ہے۔ غفور کے تصور میں انسان پوری طرح اپنے لیے ذہنی تسکین کا سامان پالیتا ہے۔ قرآن کی یہ آیت اِس معاملے میں انسان کی رہ نما ہے: **قُل یا عِبادِيَ الّذین أسرفوا علیٰ أنفسهم لا تقنطوا من رّحمة الله، إن الله یغفرالذّنوب جمیعاً، إنّه هو الغفور الرّحیم**۔ یعنی کہو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک، اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے (الزّمر: 53)۔

پوائنٹ آف ریفرنس

قرآن میں خدا کے جو اسماءِ حسنیٰ بتائے گیے ہیں، اُن میں سے ہر نام ہم کو غور وفکر کے لیے ایک پوائنٹ آف ریفرنس دیتا ہے۔ اِن ناموں کے ذریعے ہم کو ایک متعین رہ نمائی مل جاتی ہے، جس کو لے کر ہم خدا کی ہستی کا تصور کرسکیں اور اُس کی مختلف صفات (attributes) کا تصور کرتے ہوئے خدا کی ہستی سے متعین نوعیت کا ذہنی رشتہ قائم کرسکیں۔ خدا سے اِسی تعلق کا نام معرفت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کے لیے تمام اچھے نام ہیں، اُس کے بعد فوراً یہ ارشاد ہوا ہے — پس تم اِنھیں اچھے ناموں سے خدا کو پکارو، اور اُن لوگوں کو چھوڑ دو، جو خدا کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں (الأعراف: 180)، یعنی اُنھیں ناموں کے ذریعے خدائے کامل الصفات کا تصور قائم کرو، نہ کہ اُن ناموں کے ذریعے جو دوسروں نے خود ساختہ طور پر بنا لیے ہیں۔

خدا کیا ہے۔ خدا ایک اعتبار سے ہمارے عجز (helplessness) کی تلافی ہے۔ انسان اپنی تخلیق کے لحاظ سے عاجزِ مطلق ہے، اور خدا خالق ومالک ہونے کی بنا پر قادرِ مطلق۔ اِس لیے یہ فطری ہے کہ انسان ہر موقعے پر خدا کو پکارے۔ خدا کے اسماءِ حسنیٰ اِس کام میں انسان کے لیے مددگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خدا کے یہ تمام نام دراصل انسان کی نسبت سے ہیں۔ انسان اپنی نفسیات کے اعتبار سے جن خدائی حوالوں کا محتاج ہے، وہ تمام خدائی حوالے اِن ناموں کے اندر موجود ہیں۔ آدمی کے اندر جب بھی اپنے عجز، اپنی عبدیت، اور اپنی حیثیتِ انسانی کے اعتبار سے کوئی جذبہ جاگتا ہے تو یہ خدائی نام اُس کو فوراً ایک رہ نما لفظ دے دیتے ہیں۔ اِن رہ نما الفاظ کے ذریعے سے وہ اُسی طرح خدائے رب العالمین سے مربوط ہوجاتا ہے، جس طرح ٹیلی فون پر ایک نمبر ڈائل کر کے وہ اپنی مطلوب شخصیت سے فی الفور ربط قائم کرلیتا ہے۔

چند مثالیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان پیدائشی طور پر ایک متلاشی حیوان (truth-seeking animal) ہے۔ اِس چھپی ہوئی فطرت کے زیرِ اثر آدمی کے اندر یہ جذبہ جاگتا ہے کہ کوئی برتر ہستی ہو جو اُس کو ہدایت کی روشنی عطا فرمائے۔ اُس وقت وہ پکار اٹھتا ہے کہ اے خدائے ہادی، تو مجھ کو اپنی رحمتِ خاص سے ہدایت عطا فرما۔

موجودہ دنیا میں انسان بار بار ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے، جہاں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ اُس وقت اُس کی فطرت میں چھپا ہوا جذبہ چاہتا ہے کہ وہ ایک بالاتر ہستی کو پکارے۔ یہاں وہ اسماءِ حسنیٰ میں اِس بالاتر ہستی کا ایک متعلق خدائی نام پالیتا ہے اور اُس کے حوالے سے وہ یہ کہہ اٹھتا ہے کہ اے خدا، تو ہی میرا ناصر ہے، تو ہر اعتبار سے میری مدد فرما۔

انسان مجرد طور پر نہیں سوچ سکتا۔ اپنی ذہنی ساخت کے اعتبار سے انسان کو ہمیشہ الفاظ درکار ہوتے ہیں، جن کے ذریعے وہ کسی تصور کو اپنے ذہن میں لاسکے۔ خدا کے اسماءِ حسنی کی نوعیت یہی ہے۔ یہ اسماءِ حسنیٰ یہ بتانے کے لیے نہیں ہیں کہ مطلق طور پر خدا کے نام کیا کیا ہیں، وہ صرف اُن اسماء کو بتاتے ہیں جو انسان کی نسبت سے ہم کو درکار ہیں۔ گویا کہ یہ اسماءِ حسنیٰ ضرورتِ انسانی کے اعتبار سے بتائے گیے ہیں، نہ کہ خود ذاتِ خداوندی کی حقیقتِ اعلیٰ کے اعتبار سے۔

اسماءِ حسنیٰ سے مراد صفاتِ حسنیٰ ہیں، مگر اسماءِ حسنیٰ خود خدا کی مطلق نسبت سے خدا کا تعارف نہیں

ہیں، وہ انسان کی نسبت سے خدا کا تعارف ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ دراصل، ذکر اور دعا کے لیے انسان کو پوائنٹ آف ریفرنس دیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کو رزق درکار ہے تو وہ خدا سے کہہ سکے کہ — اے رزّاق، تو مجھے رزق دے دے۔ ایک شخص اپنے کو عاجز محسوس کرتا ہے تو وہ کہہ سکے کہ — اے قادرِ حقیقی، تو میرے عجز کی تلافی فرما۔

پُراسرار نہیں

اسماءِ حسنیٰ کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ وہ حروفِ مقطّعات کی مانند کچھ پراسرار الفاظ ہیں۔ اِن الفاظ کے اندر کوئی معجزاتی تاثیر چھپی ہوئی ہے، جیسے کہ جادوگروں کے منتر میں ہوتی ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اُن کو یاد کرکے اُن کا وِرد کرتے رہیں۔ اور پھر پُراسرار طور پر ہمیں ان کے انوکھے فوائد ملتے رہیں گے۔ اکثر لوگوں کے دماغ میں اِسی قسم کا تصور بسا ہوا ہے۔

مگر اسماءِ حسنیٰ کے بارے میں اِس قسم کا تصور سرتاسر بے بنیاد ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کسی بھی درجے میں پُراسرار الفاظ نہیں، وہ پورے معنوں میں ایک معلوم اور بامعنیٰ حقیقت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کا معاملہ بلاشبہہ انسان کے لیے ایک عظیم رحمت کا معاملہ ہے۔ مگر یہ رحمت کوئی پُراسرار رحمت نہیں، بلکہ وہ ایک ایسی رحمت ہے جو پوری طرح ہمارے معلوم دائرے کی چیز ہے اور علمی طور پر اس کی تشریح کی جاسکتی ہے۔

اسماءِ حسنیٰ دراصل، خدا کی رحمتوں کے معلوم دروازے ہیں۔ قرآن میں ان دروازوں کو اس لیے کھولا گیا ہے کہ آدمی ان کی دریافت کرے اور ان کے راستے سے گزر کر وہ خدا کی رحمتوں کی دنیا میں پہنچ جائے۔ اسماءِ حسنیٰ گویا کہ رحمتِ خداوندی کے ابوابِ حسنیٰ ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ ہم کو خدا سے مربوط کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی وہ کلیدِ معرفت ہے جو ہمارے دل ودماغ کو بیدار کرتی ہے اور ہم کو تاریکی سے روشنی کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہے۔

اسماءِ حسنیٰ اور انسان

اگر ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں کمیونکیشن کی تاریخ بتائی گئی ہو۔ اِس کتاب میں

نامہ بر کبوتر، ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور موبائل جیسے نام ہوں۔ اس کتاب کو ایک شخص پڑھے، خواہ وہ کتاب کی زبان سے بخوبی واقف ہو، لیکن اگر نامہ بر کبوتر، ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور موبائل جیسی چیزوں کو اُس نے دیکھا نہ ہو تو وہ اِن چیزوں کی حقیقت کے بارے میں کچھ نہ جان سکے گا۔ اِس قسم کی کوئی کتاب ایک واقف کار انسان کے لیے ایک معلوماتی کتاب ہے، لیکن ایک ناواقف انسان کے لیے وہ صرف ایک معمّا بن کر رہ جائے گی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ اسماءِ حسنیٰ کا ہے۔ خدا کے اسماءِ حسنیٰ، قرآن اور حدیث میں نام بہ نام بتا دیے گیے ہیں، لیکن اِن ناموں کو قرآن اور حدیث میں پڑھ لینا کافی نہیں۔ قرآن اور حدیث میں بیان ہونے کے باوجود یہ تمام نام کسی انسان کے لیے ایک نامعلوم چیز کی دریافت (discovery) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی آدمی اِن ناموں کی حقیقت کو صرف اُس وقت جان سکتا ہے، جب کہ اِس سے پہلے وہ ذاتی دریافت کی سطح پر اُن کا علم حاصل کر چکا ہو۔ ذاتی دریافت کے بغیر یہ نام کسی آدمی کے لیے صرف رسمی نام ہوں گے، نہ کہ معرفتِ خداوندی کا خزانہ۔

اسمِ اعظم

اسماءِ حسنیٰ کے ذیل میں ایک بحث یہ ہے کہ کیا خدا کا کوئی اسمِ اعظم ہے، اور اگر ہے تو وہ کیا ہے۔ اسم اعظم کے متعلق مختلف روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ اس سلسلے میں مسند امام احمد کی دو روایتیں اِس طرح ہیں:

1- **عن أنس بن مالک أنّ النبی صلی الله علیه وسلم سمع رجلاً یقول: اللهم إنی أسئلک أنّ لک الحمد، لاإله إلا أنتَ وحدک، لا شریک لک، المنّان، بدیع السّموات والأرض، ذاالجلال والإکرام۔ فقال النبی صلی الله علیه وسلم: لقد سألتَ الله بإسم الله الأعظم، الذی إذا دُعی به أجاب، وإذا سُئل به أعطیٰ** (جلد3، صفحہ 120)۔

2- **عن عبد الله بن بُریدة عن أبیه قال: سمع النبی صلی الله علیه وسلم**

رجلاً يقول اللهم إنّی أسئلک بأنّی أشهد أنک أنت الله، الذی لا إلٰه إلا أنت، الأحد الصمد، الذی لم یلد و لم یُولد، ولم یکن له کفواً أحد، فقال: قد سألتَ الله بإسم الله الأعظم، الذی إذا سُئل به أعطیٰ، وإذا دُعی به أجابَ (جلد5،صفحہ350)۔

ترجمہ: انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: اے اللہ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ تیرے ہی لیے حمد ہے۔ تو ہی الٰہ ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔ تو بڑا احسان کرنے والا ہے۔ زمین اور آسمان کو کسی نمونے کے بغیر پیدا کرنے والا ہے۔ تو عزت اور کبریائی والا ہے۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے اللہ کو اُس کے اُس اسمِ اعظم کے ساتھ پکارا، جس کے ساتھ اُس کو پکارا جائے تو وہ ضرور پکار کا جواب دیتا ہے، اور جب اُس کے ساتھ سوال کیا جائے تو وہ عطا کرتا ہے۔

عبد اللہ بن بُریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے ہیں ہوئے سُنا کہ: اے اللہ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ہی اللہ ہے، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ تو اکیلا ہے، تو بے نیاز ہے۔ تو نے نہ کسی کو جَنا اور نہ تجھے کسی نے جنا۔ اور تیرے برابر کوئی نہیں۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے اللہ سے اُس کے اُس اسمِ اعظم کے ساتھ سوال کیا ہے، جس کے ساتھ اُس سے مانگا جائے تو وہ ضرور عطا کرتا ہے۔ اور جب اُس کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ ضرور اُس کو قبول کرتا ہے۔

دونوں روایتوں میں اللہ کے ساتھ اُس کے اور کئی صفاتی نام آئے ہیں۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسمِ اعظم سے مراد کوئی ایک نام نہیں ہوسکتا۔ اگر اسمِ اعظم کوئی ایک نام ہوتا تو صحابی کی مذکورہ دعا میں بھی صرف وہی ایک نام ہوتا، جب کہ اِس دعا میں واضح طور پر خدا کے کئی نام ہیں۔ اِس واضح اشارے کے باوجود اسمِ اعظم کو خدا کا کوئی ایک نام سمجھنا اور اُسی ایک نام کی تلاش میں لگے رہنا، بلاشبہہ ایک غلطی ہوگی۔ اسمِ اعظم کسی لفظِ اعظم کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ مفہومِ اعظم کا نام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسمِ اعظم سے مراد خدا کا کوئی ایک نام نہیں ہے، بلکہ وہ خصوصی کیفیت کے

ساتھ خدا کو پکارنے کا نام ہے۔ اسمِ اعظم سے مراد، اسمِ اعظم نہیں ہے بلکہ کیفیتِ اعظم ہے۔ مذکورہ دعا میں صحابی نے کسی رٹے ہوئے دعائیہ لفظ کو استعمال نہیں کیا، بلکہ جذبات کے وفور میں ان کی زبان سے کچھ خاص الفاظ نکل گیے، اِسی کا نام اسمِ اعظم کے ساتھ خدا کو پکارنا ہے۔ اسمِ اعظم کا تعلق دراصل ربانی کیفیت سے ہے۔ کیفیت سے بھرے ہوئے الفاظ میں خدا کو پکارنے کا نام اسمِ اعظم ہے۔

ایک وضاحت

مذکورہ حدیث میں ایک صحابی کی دعا کا ذکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ دعا کے متعلق فرمایا کہ یہ دعا اسمِ اعظم کی دعا تھی۔ چوں کہ یہ دعا صحابی نے عربی زبان میں کی تھی، اِس لیے لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اسمِ اعظم والی دعا وہی ہے جو عربی زبان میں کی گئی ہو، غیر عربی زبان کی دعا اسمِ اعظم کی دعا نہیں۔

مگر یہ سوچ درست نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، صحابی نے جو دعا کی، وہ ان کی اپنی مادری زبان میں تھی، نہ کہ سادہ طور پر عربی زبان میں۔ دعا کو عربی زبان کے ساتھ مخصوص کرنا، ایک غیر فطری نظریہ ہے۔ دعا دل کے جذبات کا نام ہے، نہ کہ کسی زبان کے الفاظ کا نام۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہر پیغمبر اپنی قوم کی زبان میں بھیجا گیا (إبراھیم: 4)، یہی معاملہ دعا کا بھی ہے۔ جس طرح دعوت مخاطب قوم کی زبان میں ہوتی ہے، اِسی طرح دعا، دعا کرنے والے کی اپنی مادری زبان میں ہوتی ہے۔

ایسا ماننا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ اگر دعا کو عربی زبان کے ساتھ مخصوص کردیا جائے، یا عربی زبان کی دعا کو افضل دعا بتایا جائے تو یہ دعا کی اصل روح کو ختم کرنے کے ہم معنیٰ ہوگا۔ دعا کسی قسم کی تکرارِ الفاظ کا نام نہیں، دعا تڑپتے ہوئے دل کی پکار کا نام ہے، اور ایسی دعا ہمیشہ آدمی کی اپنی مادری زبان ہی میں ظہور میں آتی ہے۔

دعا کیا ہے

دعا کسی ٹکنکل واقعے کا نام نہیں، دعا ایک داخلی طوفان کا خارجی اظہار ہے۔ جب ایک انسان

خدا کو اُس کی عظمت و کبریائی کے ساتھ دریافت کرتا ہے، جب ایسا ہوتا ہے کہ خدا کے بارے میں سوچتے ہوئے اُس کو خدا کی موجودگی کا اتنا شدید احساس ہوتا ہے کہ گویا وہ خدا کے پڑوس میں پہنچ گیا ہے۔ جب اُس پر وہ طوفانی تجربہ گزرتا ہے، جس کو حدیث میں: **ذَکَر الله خالیاً، ففاضت عیناہ (البخاری، کتاب الرّقاق)** کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی آدمی نے اپنی تنہائی میں خدا کو یاد کیا اور شدتِ تاثر سے اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔ اُس نے دنیائے امتحان کے بارے میں سوچا، اُس نے موت اور روزِ حساب کا گہرا ادراک کیا، وہ اُن ربّانی کیفیات سے گزرا، جب کہ انسان کو جہنم کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف اُس کو جنت کے ابدی مناظر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جب اُس پر یادِ خداوندی کا وہ گہرا تجربہ گزرتا ہے، جب کہ سب کچھ اس کی نظروں سے محو ہو جاتا ہے، خدا کے سوا ہر چیز اُس کی نظر میں بے حقیقت بن جاتی ہے۔

ایسے طوفان خیز لمحات میں یہ ہوتا ہے کہ اُس کے دل و دماغ میں ایک بھونچال آجاتا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے خوفِ خدا کا سمندر اُمڈ پڑتا ہے۔ جب سوچنے کی صلاحیت بظاہر ختم ہو جاتی ہے اور صرف محسوس کرنے کی صلاحیت باقی رہتی۔ اُس وقت ایسا ہوتا ہے کہ انسان بے تابانہ طور پر اپنے رب کو پکارنے لگتا ہے۔ اُس کے اندر چھپی ہوئی ربّانی فطرت الفاظ کی صورت میں بہہ پڑتی ہے۔ ایسے طوفانی لمحات میں آدمی کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے، اُسی کا نام دعا ہے۔ یہی وہ دعا ہوتی ہے جو اسمِ اعظم کی زبان میں نکلتی ہے اور ایسی دعا ہمیشہ اپنی پہلی زبان میں ہوتی ہے، نہ کہ اپنی دوسری زبان میں۔

ایک واقعہ

میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں دس سال سے ایک سوال کا جواب تلاش کر رہا ہوں، لیکن اب تک مجھے اُس کا جواب نہیں ملا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا وہ کیا سوال ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اسمِ اعظم کیا ہے۔ اِس سلسلے میں، میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں، بہت سے علما اور بزرگوں سے ملاقاتیں کیں، مگر اب تک کسی نے اِس کا تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ اب میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو آپ مجھے اس کا جواب دے کر میری پریشانی کو دور فرمائیں۔

میں نے کہا آپ کی پریشانی ایک خود ساختہ پریشانی ہے۔ آپ نے یہ فرض کرلیا ہے کہ اسمِ اعظم جادو کے منتر کی طرح کوئی منتر ہے۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ منتر کا وہ لفظ آپ کو معلوم ہوجائے، مگر ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ اسمِ اعظم کسی لفظ کا نام نہیں ہے، بلکہ کیفیت کا نام ہے۔ کیفیتِ اعظم کے ساتھ جو دعا کی جائے، وہی اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ یہ دراصل آپ کی اپنی قلبی کیفیت ہے جو کسی دعا کو اسمِ اعظم کی دعا بناتی ہے۔ کسی انسانی لفظ میں یہ طاقت نہیں کہ وہ خدا کا اسمِ اعظم بن جائے، وہ خدا کی لامحدود ہستی کا احاطہ کرلے۔

میں نے کہا کہ آپ ہی کی طرح کا ایک شخص تھا۔ اُس کو ایک خزانے کی تلاش تھی۔ اُس کو معلوم ہوا کہ یہ خزانہ فلاں پہاڑ کی چوٹی پر ایک محل کے اندر رکھا ہوا ہے۔ اِس محل کے گیٹ پر ایک تالا لگا ہوا ہے۔ یہ تالا کسی کنجی سے نہیں کھلتا، بلکہ وہ ایک منتر سے کھلتا ہے۔ اب اُس کو اُس منتر کی تلاش ہوئی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ ایک جگہ پہنچا۔ یہاں اُس کی ملاقات ایک سادھو سے ہوئی۔ جو اُس منتر کو جانتا تھا۔

اس نے سادھو سے درخواست کی کہ وہ اُس کو یہ منتر بتا دے۔ سادھو نے اُس کو وہ منتر بتا دیا۔ سادھو نے کہا کہ وہ منتر ''سِم سِم'' ہے۔ تم فلاں پہاڑ کی چوٹی پر جاؤ۔ وہاں تم کو ایک محل ملے گا۔ اِس محل کے گیٹ پر ایک تالا لٹکا ہوگا۔ تم اُس کے سامنے کھڑے ہو کر کہنا: کُھل اے سِم سِم، کھل اے سِم سِم، پھر وہ تالا کھل جائے گا۔ وہ آدمی روانہ ہوا۔ لمبے سفر کے بعد وہ محل کے گیٹ پر پہنچا، مگر اُس وقت وہ منتر کو بھول چکا تھا۔ وہ گیٹ کے سامنے کھڑا ہو کر دوسرے دوسرے الفاظ بولتا رہا۔ مثلاً کُھل اے ٹَم ٹَم، کھل اے دَم دَم، کھل اے بم بم، مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اب وہ وہاں سے واپس ہو کر دوبارہ سادھو کے پاس گیا۔ سادھو نے کہا کہ تم غلط منتر بول رہے تھے، اس لیے تالا نہیں کھلا۔ دوبارہ جاؤ اور سم سم کہو۔ آدمی نے منتر کو خوب اچھی طرح یاد کرلیا اور سفر کرکے دوبارہ وہاں پہنچا۔ اُس نے محل کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا: کھل اے سِم سِم اور پھر فوراً دروازہ کھل گیا۔

اکثر لوگ اسم اعظم کو اِسی قسم کا ایک طلسماتی لفظ سمجھتے ہیں، مگر اِس قسم کی سوچ بالکل غلط ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسمِ اعظم ڈکشنری کے کسی لفظ کا نام نہیں، وہ انسان کی اپنی داخلی کیفیت کا نام ہے۔ جب بھی کوئی سچا بندہ، اعلیٰ قلبی کیفیات کے ساتھ دعا کرتا ہے تو اُس کو فرشتوں کی مدد حاصل ہوجاتی ہے۔ اُس وقت اُس کے اندر سے مخصوص قسم کے ربّانی الفاظ نکلنے لگتے ہیں، اِسی کا نام اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ اِس قسم کی دعا، خدائی الہام کے تحت ہوتی ہے اور جو دعا خدائی الہام کے تحت انسان کے دل سے نکلے، اُس کا معاملہ وہی ہوتا ہے جو ایک فارسی شاعر نے اِن الفاظ میں نظم کیا ہے:

اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

مقبول دعا

حقیقی دعا آدمی کی پوری ہستی سے نکلتی ہے، نہ کہ محض زبانی الفاظ سے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا سے مانگنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ مگر مانگنا صرف کچھ لفظوں کو دہرانے کا نام نہیں۔ مانگنا وہی مانگنا ہے جس میں آدمی کی پوری ہستی شامل ہوگئی ہو۔ ایک شخص زبان سے کہہ رہا ہو: خدایا! مجھے اپنا بنالے، مگر عملاً وہ اپنی ذات کا بنا رہے، تو یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے مانگا ہی نہیں، اس کو جو چیز ملی ہوئی ہے، وہی دراصل اس نے خدا سے مانگی تھی، خواہ زبان سے اس نے جو لفظ بھی ادا کئے ہوں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دے دے، آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو خدا فراموشی میں مبتلا کردے، آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور خدا آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے، آپ کیفیت سے بھری ہوئی دین داری مانگیں اور خدا آپ کو بے روح دین داری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور خدا آپ کو گم راہی کے اندھیروں میں بھٹکتا چھوڑ دے۔

آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا، اِس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو پیسے خرچ کرنے کے

بعد بھی آپ خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔ اسی طرح اگر آپ زبان سے دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں، مگر آپ کی اصل ہستی کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا، جو مانگے وہ کبھی پائے بغیر نہیں رہتا۔ یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اِس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا، میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے وہ چیز نہ دی۔ بخدا، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح وشام اپنے تمام خزانوں کے ساتھ آپ کے قریب آکر آواز دیتا ہے— ''کون ہے جو مجھ سے مانگے، تاکہ میں اسے دوں''۔ مگر جنھیں لینا ہے وہ اس سے غافل بنے ہوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

دعا کی طاقت

حدیث میں آیا ہے کہ: **لا یردّ القضاء إلا الدعاء (التّرمذی، کتاب القدر)** یعنی قضا اور قدر کے فیصلے کو صرف دعا بدل سکتی ہے۔ خدا نے اِس دنیا کا نظام اسباب وعلل کی بنیاد پر قائم کیا ہے، اور پھر انسان کو مکمل آزادی دے دی ہے۔ اب انسان اپنی آزادی کے مطابق عمل کرتا ہے اور خدا کے قائم کردہ نظام اسباب وعلل سے مطابقت یا مخالفت کی بنیاد پر اس کا اچھا یا بُرا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظام بالکل حتمی ہے۔ کوئی آدمی خواہ مخلص ہو یا غیر مخلص، اُس کو بہر حال اِس نظام کو بھُگتنا ہے۔ کسی بھی شخص کے لیے اِس نظام کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔

اِس معاملے میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ دعا کا ہے۔ کوئی آدمی جب سچی دعا کرتا ہے اور اُس وقت اگر خدا اس کی دعا قبول کرلیتا ہے تو وہ اسباب کے نظام میں مداخلت کرکے اس کا راستہ ہموار کردیتا ہے۔ یہی مطلب ہے اِس بات کا کہ دعا، قضا اور قدر کو بدل دیتی ہے۔

لیکن دعا الفاظ کی تکرار کا نام نہیں ہے، حتی کہ قرآنی دعائیں یا ماثور دعائیں بھی اگر صرف رَٹے ہوئے الفاظ کی تکرار ہوں تو وہ بھی مؤثر نہیں ہوسکتیں۔ نظامِ قضا کو بدلنے کے لیے وہ دعا درکار ہے جو دل کو پھاڑ کر کی جاتی ہے، جو دل کی پھٹن کی آواز ہوتی ہے، جس میں آدمی کا پورا وجود شامل ہوجاتا ہے،

جو انسانی شخصیت میں ایک بھونچال کے بعد ظہور میں آتی ہے۔

اِس قسم کی دعا کی قبولیت کی ایک اور شرط یہ ہے کہ دعا کرنے والے کا ذہنی تزکیہ اتنا زیادہ ہو چکا ہو کہ اس کی سوچ خدا کی سوچ بن جائے۔ ایسا آدمی وہی دعا کرے گا جو خدا کے نزدیک قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اس کی زبان سے ایسی دعا نہیں نکلے گی جو خدا کی سنّت کے مطابق، قابلِ قبول ہی نہیں۔

پیغمبر کی دعا کی مثال

خدا کے تمام پیغمبروں نے اسمِ اعظم کے ساتھ دعائیں کی ہیں۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے موقع پر میدان جنگ کی طرف نگاہ ڈالی تو آپ کو نظر آیا کہ طاقت ور مشرک فوج کے مقابلے میں، مؤحدین کی ایک کم زور فوج کھڑی ہوئی ہے، جو تعداد میں بھی کم ہے اور سامانِ حرب میں بھی کم۔ اِس نابرابری کو دیکھ کر آپ کے جذبات میں ایک ہیجان پیدا ہوا۔ آپ کمالِ عجز کے ساتھ خدا کے سامنے زمین پر سجدے میں گر پڑے۔ اُس وقت آپ کی زبان سے دعا کرتے ہوئے یہ الفاظ نکلے:

اللهم، إن تهلک هٰذه العصابة من أهل الإسلام، لا تعبد فی الأرض أبداً (مسند احمد، جلد ا، صفحہ 30)۔ یعنی اے اللہ، اگر تو اہلِ اسلام کے اِس گروہ کو آج ہلاک کر دے تو اس کے بعد زمین پر کبھی تیری عبادت نہ ہوگی۔ یہ دعا بھی اپنے ربّانی جذبات کے اعتبار سے اسمِ اعظم کے ساتھ کی جانے والی دعا تھی، جو کامل طور پر قبول ہوئی۔ کم زور گروہ نے خدا کی مدد سے طاقت ور گروہ کو مکمل شکست دے دی۔

اسمِ اعظم کے ساتھ دعا، صرف پیغمبروں کے ساتھ خاص نہیں، اِس دعا کی توفیق ہر بندۂ خدا کو ملتی ہے۔ جو شخص بھی ایمان اور اخلاص کے اعلیٰ ربّانی جذبات کے ساتھ خدا کی طرف رجوع ہو، وہ خدا کی مدد سے اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنے کی توفیق پاتا ہے۔ اِس کی پہچان یہ ہے کہ ایسی دعا کے موقع پر آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کا پورا وجود خدا کی تجلّی میں نہا اٹھا ہے۔ اُس وقت وہ ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جو اُس نے اِس سے پہلے کبھی سوچے نہیں تھے۔ تاریخ میں بہت سے خدا کے بندے ہیں، جن کو اِس قسم کی دعاءِ اعظم کی توفیق ملی ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر 9 میں کچھ اہلِ ایمان کا ذکر ہے۔ غزوۂ تبوک (8 ہجری) کے موقع پر چوں کہ نفیرِ عام تھی، اس لیے وہ اُس میں جانا چاہتے تھے۔ مگر اُن کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ اِس طویل سفر کے لیے ضروری سامان کی تیاری کرسکیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدد کے لیے آئے، مگر آپ نے معذرت فرمائی۔ اِس واقعے کا اشارہ قرآن کی ایک آیت میں اِس طرح کیا گیا ہے: اور نہ اُن لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب وہ تمھارے پاس آئے کہ تم اُن کو سواری دو، تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ میں تم کو اُس پر سوار کروں، تو وہ اِس حال میں واپس ہوئے کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اِس غم میں کہ اُنھیں کچھ میسر نہیں جو وہ خرچ کریں (التوبة: 92)۔

یہ افراد غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہوسکے، مگر ایک حدیثِ رسول کے مطابق، خدا کے نزدیک وہ اُس میں شریک مانے گیے۔ غزوۂ تبوک سے واپس ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے متعلق اپنے اصحاب سے فرمایا: **إنّ بالمدينة أقواماً، ماسِرتُم مسيراً، ولا أنفقتُم من نفقةٍ، ولا قطعتم من وادٍ، إلاّ وهُم معكم فيه**۔ یعنی مدینہ میں کچھ ایسے افراد ہیں کہ تم جب کسی راستے پر چلے، یا جب بھی تم نے کچھ مال خرچ کیا، یا تم کسی وادی سے گزرے تو وہ اُس میں تمھارے ساتھ تھے (القرطبی، جلد 8، 292، مسند احمد، جلد 3، صفحہ 103)۔

یہ بڑا عجیب انعام تھا جو مدینہ کے اُن افراد کو ملا، یعنی عمل کے بغیر عمل کے انعام میں شرکت۔ میں غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ انوکھا انعام اُن کو اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کی بنا پر ملا۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے کہ وہ اپنی تنہائیوں میں رو رو کر یہ دعا کر رہے ہوں کہ — خدایا، تو نے دوسروں کو جو انعام عادل ہونے کی حیثیت سے دیا، وہ انعام مجھ کو رحیم ہونے کی حیثیت سے دے دے۔ تو نے دوسروں کے لیے جو چیز اُن کے عمل کی بنا پر مقدر کی، وہ چیز میرے لیے میری دعا کے نتیجے میں مقدر کردے۔ تو نے جو کچھ دوسروں کو استحقاق کی بنا پر عطا فرمایا، وہ چیز مجھ کو سوال کرنے والے کی حیثیت سے دے دے۔ دوسروں کو جو چیز تو نے استطاعت کی بنا پر دی، وہ مجھ کو عجز کی بنا پر دے دے۔

تونے دوسروں کو جو چیز مومنِ قوی ہونے کی حیثیت سے دی، وہ مجھ کو مومنِ ضعیف ہونے کی حیثیت سے دے دے، کیوں کہ تیرے رسول نے ہم کو یہ خبر دی ہے کہ: ضعیف مومن کے لیے بھی خیر ہے(وفي كلٍّ خير، صحیح مسلم، کتاب القدر)۔

اسمِ اعظم کا علم خدا کو

اسمِ اعظم، اسماءِ حسنیٰ سے الگ کوئی نام نہیں، وہ اُنھیں ناموں میں شامل ہے۔ اسماءِ حسنیٰ میں سے کوئی اسم، اُس وقت اسمِ اعظم بن جاتا ہے، جب کہ دعا کرنے والا اُس کو ایک غیر معمولی جذبے کے تحت استعمال کرے۔ پکارنے والے کا جذبۂ اعظم، اسماءِ حسنیٰ میں سے کسی اسم کو اسمِ اعظم بنا دیتا ہے۔

اسمِ اعظم کوئی پُر اسرار منتر نہیں، وہ مکمل طور پر ایک معلوم حقیقت ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ پکارنے والا یہ جانے کہ اُس نے اسمِ اعظم کے ذریعے خدا کو پکارا ہے۔ یہ دراصل خدا کی قبولیت ہے جو کسی اسم کو اسمِ اعظم کا درجہ دے دیتی ہے۔ اسم بظاہر ایک معلوم لفظ کا نام ہے، لیکن کسی چیز کا اسمِ اعظم ہونا، تمام تر داخلی اسپرٹ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ چوں کہ داخلی اسپرٹ کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اِس لیے یہ صرف اللہ ہے جو جانتا ہے کہ کب اُس کے کسی بندے نے اُس کو اسمِ اعظم کے ساتھ پکارا۔ یہ حقیقت صرف آخرت میں کھلے گی کہ وہ کون خوش قسمت انسان تھا جس کو اسمِ اعظم کے ساتھ خدا کو پکارنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ اس معاملے میں اگر ہم کچھ کہتے ہیں تو وہ صرف بَر بناءِ قیاس ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو حقیقی علم کی بنیاد پر اِس بارے میں کوئی رائے دے سکے۔

خدا اور بندے کے درمیان

خدا نے انسان کے لیے اپنے جن اسماءِ حسنیٰ کا تعارف کرایا ہے، وہ انسان کے اوپر ایک دروازۂ رحمت کھولنے کے ہم معنیٰ ہے۔ اسماءِ حسنیٰ یہ بتاتے ہیں کہ بندے اور خدا کے درمیان مواقعِ اتصال (meeting points) کیا کیا ہیں۔ اِن مواقعِ اتصال کے ذریعے بندہ، خدا سے قربت حاصل کرسکتا ہے۔ پھر اگر بندے کی اسپرٹ بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہو تو وہ اِس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے ذکر اور اپنی دعا میں اسمِ اعظم کا استعمال کر سکے، یعنی اُس اسم یا نام کا استعمال جس کے استعمال کے

بعد ربّانی اتصال اچانک اسی طرح ممکن ہو جاتا ہے، جس طرح بجلی کا سوئچ دبانے کے بعد اچانک بجلی کے بلب کا فوراً روشن ہو جانا۔

یہ معاملہ کوئی پُراسرار معاملہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فطرت کا ایک قانون ہے، جس کو خود انسانوں کے درمیان محسوس تعلقات کا مطالعہ کرکے سمجھا جاسکتا ہے۔

دعا اور سپر دعا

دعا، یا خدا کو پکارنے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے سادہ طور پر کچھ متعین الفاظ بول کر خدا سے مانگنا۔ دوسری دعا وہ ہے جس کو سپر دعا کہا جاسکتا ہے۔ یہ دعا کی وہ قسم ہے جس کو پکارنے والا ایسے الفاظ اور ایسے انداز میں پکارتا ہے کہ وہ خود خدا کے لیے، بلاتشبیہہ، اُسی طرح ایک ذاتی مسئلہ بن جاتا ہے، جس طرح وہ دعا کرنے والے کے لیے ایک ذاتی مسئلہ تھا۔ پہلی دعا اگر روایتی دعا (traditional dua) ہے تو دوسری دعا تخلیقی دعا (creative dua) ہے۔ انگریزی میں پہلی قسم کی دعا کو رِکویسٹ (request) کرنا کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کی دعا کو اِنووک (invoke) کرنا، جیسے کہ کہا جائے:

The Almighty God was invoked by his call.

دعا اور اسم اعظم کی دعا میں یہی فرق ہے۔ دعا عام قسم کی ایک دعا ہے، اور اسمِ اعظم کی دعا گویا کہ ایک سپر دعا۔ یہاں ہم ایک واقعہ نقل کریں گے جو سپر دعا کے معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک واضح مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک واقعہ

رام پور (یوپی) کا واقعہ ہے۔ ایک بچے نے اپنے باپ سے کہا کہ — میرے لیے ایک بائیسکل خرید دیجئے۔ باپ کی آمدنی کم تھی، وہ بائیسکل خریدنے کی پوزیشن میں نہ تھا، اس نے ٹال دیا۔ لڑکا بار بار کہتا رہا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔ بالآخر ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا: میں نے کہہ دیا کہ میں بائیسکل نہیں خرید سکتا۔ اب آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا، ورنہ میں تم کو ماروں گا۔

یہ سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد وہ روتے ہوئے

بولا— آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں، آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔ اس جملے نے باپ کو تڑپا دیا۔ اچانک اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے کہا: اچھا بیٹے اطمینان رکھو، میں تمھارے لیے بائیسکل خریدوں گا، اور کل ہی خریدوں گا۔ یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اگلے دن اس نے پیسے کا انتظام کرکے بیٹے کے لیے ایک نئی بائیسکل خریددی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا، مگر یہ ایک ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی، جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہوگئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کردیا ہے۔ یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے نقطے پر کھڑا کردیا جہاں اس کی درخواست اس کے سرپرست کے لیے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا کہ وہ خود اس کے لیے تھی۔ بیٹے کے الفاظ نے باپ کو اِس سنگین سوال سے دوچار کردیا کہ اگر وہ اپنے بیٹے کو بائیسکل نہ دے تو اُس کی پِدریت (fatherhood) ہی مشتبہ ہوجائے گی۔

اس واقعے سے سمجھا جاسکتا ہے کہ دعا کی وہ کون سی قسم ہے جس کے بعد خدا کی رحمتیں بندے کے اوپر امڈ آتی ہیں۔ یہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں ہے، نہ اس کا کوئی ''رسمی نصاب'' ہے۔ یہ دعا کی وہ قسم ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔ جب بندے کی آنکھ سے عجز کا وہ قطرہ ٹپک پڑتا ہے جس کا تحمل زمین اور آسمان بھی نہ کرسکیں۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کردیتا ہے کہ ''مانگنے والا'' اور ''دینے والا'' دونوں ایک ترازو پر آجاتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ دعا، محض لغت کا ایک لفظ نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتا ہے۔ اُس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک دوسرے سے راضی ہوجاتے ہیں۔ قادرِ مطلق، عاجزِ مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

اِس واقعے پر غور کیجیے تو اس میں دونوں قسم کی دعا کی مثال نظر آئے گی۔ مذکورہ بچے نے جب پہلی بار اپنے باپ سے یہ کہا کہ مجھے ایک بائیسکل خرید دیجیے تو اُس نے گویا کہ صرف دعا کی، لیکن دوسری بار جب اُس نے روکر یہ کہا کہ آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں، آپ سے بائیسکل کے لیے نہ کہیں تو

اور کس سے کہیں۔ جب بچے کی زبان سے یہ دوسرے الفاظ نکلے تو وہ گویا کہ ایک سپر دعا تھی۔ پہلے قسم کے الفاظ سے باپ پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا، لیکن دوسرے قسم کے الفاظ نے باپ کو پگھلا دیا۔ اب وہ اتنا متاثر ہوا کہ وہ فوراً بائیسکل خریدنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اِس مثال سے عام قسم کی دعا اور اسمِ اعظم کی دعا کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ عام قسم کی دعا، محض دعائیہ الفاظ کو زبان سے دہرا دینے کا نام ہے، لیکن اسمِ اعظم کے ساتھ کی گئی دعا گویا کہ سپر دعا ہے۔ ایسی دعا خود خدا کو ہلا دیتی ہے، جیسا کہ مظلوم کی دعا کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ: **دعوة المظلوم تحمل علی الغمام، وتفتح لها أبواب السماء، یقول الرّب عزّوجلّ: وعزّتی، لأنصرنّک ولو بعد حین** (مسند احمد، جلد 2، صفحہ 305)۔

دعا اور سپر دعا کا فرق، الفاظ میں فرق کا نام نہیں، بلکہ دعا کرنے والے کی داخلی اسپرٹ میں فرق کا نام ہے۔ یہ دراصل دعا کرنے والے کی اپنی حالتِ داخلی پر منحصر ہے کہ اُس کی زبان سے نکلنے والی دعا، سپر دعا بنے گی یا وہ صرف عام دعا بن کر رہ جائے گی۔

دو مثالیں

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے دونوں قسم کی دعاؤں کی مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ ایک شخص نے قرآنی دعاؤں کی ایک کتاب بازار سے خریدی۔ اُس میں کچھ دعائیں چھپی ہوئی تھیں۔ اُس نے اِن دعاؤں کو یاد کر لیا اور نمازوں میں اُن کو دہرانے لگا۔ مثلاً یہ دعا: **ربّنا اٰتنا فی الدنیا حسنة، و فی الأخرة حسنة، وقنا عذاب النار**۔ یعنی اے ہمارے رب، تو ہم کو دنیا میں ’حسنہ‘ دے اور تو ہم کو آخرت میں ’حسنہ‘ دے، اور تو ہم کو آگ کے عذاب سے بچا **(البقرة: 201)**۔ دعا کا یہ طریقہ روایتی دعا کی ایک مثال ہے۔

اب سپر دعا کی ایک مثال لیجیے۔ اب سے ساڑھے تین ہزار سال پہلے مصر میں ایک مشرک بادشاہ کی حکومت تھی، جس کا لقب فرعون تھا۔ اِس زمانے میں حضرت موسیٰ کا ظہور ہوا، جنھوں نے مصر میں دعوتِ توحید دی۔ فرعون خود تو حضرت موسیٰ کا مخالف بن گیا، لیکن اس کی بیوی آسیہ بنتِ مُزاحم،

حضرت موسیٰ کی دعوتِ توحید سے متاثر ہوئی اور وہ حضرت موسیٰ پر ایمان لے آئی۔

قدیم زمانے کے اعتبار سے یہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ قدیم زمانہ 'النّاسُ علیٰ دینِ مُلوکھم' کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے میں اسٹیٹ ریلیجن کو ماننا، سیاسی وفاداری کی علامت تھا۔ اسٹیٹ ریلیجن کے خلاف کسی اور ریلیجن کو ماننے والا، اسٹیٹ کا باغی سمجھا جاتا تھا اور اُس کو وہ سزا دی جاتی تھی جو ریاست سے بغاوت کے لیے مقرر ہے۔ آج ہم مذہبی آزادی کے ماحول میں جیتے ہیں، لیکن قدیم زمانے میں ہزاروں سال تک دنیا میں مذہبی جبر (religious persecution) کا نظام رائج تھا۔

یہی وہ پس منظر تھا جس میں فرعون نے آسیہ کے لیے قتل کا حکم دے دیا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اُس وقت آسیہ کی زبان سے یہ دعا نکلی: ربِّ ابْنِ لی عندک بیتاً فی الجنة۔ یعنی اے میرے رب، اپنے پاس میرے لیے جنت میں ایک گھر بنا دے (التحریم: 11)

آسیہ کی اِس دعا کو اُس کے پس منظر کی روشنی میں دیکھیے تو گویا کہ آسیہ نے یہ کہا — اے میرے رب، میں نے تیرے لیے دنیا میں بادشاہ کے محل کو چھوڑ دیا، اب تو آخرت کی ابدی دنیا میں میرے لیے اپنے پڑوس میں ایک محل بنا دے:

> I sacrifice my seat in the palace of worldly king, O Lord, give me a better seat in your neighbourhood in the world hereafter.

آسیہ بنت مزحم کی اِس دعا کے لیے بعض علما نے درست طور پر کہا کہ: ما أحسن هٰذا الکلام، یعنی کتنی اچھی ہے یہ دعا (صفوةُ التّفاسیر، جلد 3، صفحہ 412)۔

یہ دعا بلا شبہہ، ایک تخلیقی دعا تھی۔ آسیہ بنت مزاحم کے سامنے دو چیزوں کے درمیان انتخاب تھا — محل کی زندگی کی خاطر فرعون کے مشرکانہ مذہب پر قائم رہنا، یا خدا کے مُوحِّدانہ مذہب کی خاطر سفّاکانہ قتل کا سامنا کرنا۔ آسیہ کی معرفت اُس وقت اتنی زیادہ گہری ہو چکی تھی کہ اُس کو یہ فیصلہ کرتے ہوئے ایک لمحے کی دیر نہیں لگی کہ مجھے حق کی خاطر، دنیا کے وقتی محل کو چھوڑ دینا چاہیے اور خدا کی ابدی جنت کو اپنے لیے منتخب کر لینا چاہیے، خواہ اِس انتخاب کی قیمت میں مجھے قتل کر دیا جائے یا سُولی پر چڑھا دیا جائے۔

اِس پورے پس منظر کی روشنی میں دیکھیے تو آسیہ بنت مزاحم کی دعا بلاشبہہ ایک سپر دعا تھی اور وہ فوراً ہی قبول ہوگئی۔ روایات میں آیا ہے کہ موت سے پہلے فرشتوں نے آسیہ کو جنت میں اُس کے محل کا مشاہدہ کرایا۔ چناں چہ آسیہ نے اِس حال میں جان دی کہ اُس کے چہرے پر اطمینان کی خوشی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

آسیہ بنت مزاحم کی یہ دعا جو قرآن میں نقل کی گئی، وہ محض ایک فرد کی دعا نہیں ہے بلکہ وہ ایک نمائندہ دعا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد کو یہی دعا کرنا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو اِسی مرحلے سے گزرنا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو قربانی کی سطح پر جاکر یہ کہنا ہے کہ — خدایا، میں نے تیرے دین کی خاطر دنیا کی چیزوں کو چھوڑا، تاکہ تو اگلے مرحلۂ حیات میں اپنا زیادہ بہتر انعام مجھے عطا فرمائے۔ یہی وہ عورت اور مرد ہیں جن کی بابت یومُ الحساب (Day of Judgement) کے موقع پر یہ اعلان کیا جائے گا کہ انھوں نے خدا کی خاطر دنیا کی عارضی جنت کو چھوڑ دیا تھا، اب اُن کو آخرت کی زیادہ اعلیٰ جنت میں داخل کردو، تاکہ یہاں وہ ابدی طور پر خوشیوں اور راحتوں کی زندگی گزاریں اور کبھی اُکتاہٹ کے احساس کا شکار نہ ہوں۔

اسمِ اعظم ایک زندہ تجربہ

اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا، خدا کی توفیق سے ہوتا ہے۔ یہ توفیق صرف اُس انسان کو ملتی ہے جو اسمِ اعظم کی دعا سے پہلے اسمِ اعظم کی کیفیات میں جی رہا ہو۔ اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کا معاملہ کوئی پُراسرار معاملہ نہیں۔ وہ دراصل 'الإناء يترشّح بما فيه' کا معاملہ ہے، یعنی ایک انسان جو حق کا متلاشی تھا، پھر اُس کو خدا کی صورت میں حق مل گیا اور اُس کا وہ حال ہوا جس کی تصویر قرآن میں اِس طرح بیان کی گئی ہے: أوَ مَن كان ميتًا فأحييناه، وجعلنا له نوراً يمشي به في النّاس۔ یعنی وہ شخص جو مُردہ تھا، پھر ہم نے اُس کو زندگی دی اور ہم نے اُس کو ایک روشنی دی کہ اُس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے (الأنعام: 123)۔

ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ذکرِ کثیر (الأحزاب: 41) میں جینے لگتا ہے، یعنی ہر

وقت خدا کو یاد کرنا، ہر وقت خدا کے بارے میں سوچنا، ہر لمحہ خدا کی تجلّیات کا تجربہ کرنا۔ ایسا انسان گویا کہ اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنے کے لیے ایک تیار ذہن (prepared mind) ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی خاص موقع اُس کی زندگی میں پیش آتا ہے تو اُس کے اندر چھپے ہوئے ربّانی جذبات ایک طوفان بن کر اُبل پڑتے ہیں۔ اُس وقت وہ مخصوص قسم کے الہامی الفاظ میں خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ ایک تیار ذہن سے نکلنے والی اِسی قسم کی الہامی دعا کا نام اسمِ اعظم کے ساتھ خدا کو پکارنا ہے۔

ایک صالح خاتون کا واقعہ

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، فرعون کی بیوی آسیہ بنتِ مُزاحم خفیہ طور پر حضرت موسیٰ کے دین پر ایمان لائی تھی۔ جب فرعون کو اِس کا علم ہوا تو وہ بہت غصہ ہوا اور اُس کے قتل کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اُس وقت آسیہ کی زبان سے ایک دعا نکلی جو قرآن میں اِن الفاظ میں آئی ہے: **ربِّ ابْنِ لی عندک بیتاً فی الجنّة، ونجِّنی من فرعون وعمله، ونجّنی من القوم الظّالمین**۔ یعنی اے میرے رب، میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھ کو فرعون اور اُس کے عمل سے بچا لے اور مجھ کو ظالم قوم سے نجات دے (**التّحریم: 11**)۔

یہ دعا ایک ایسی دعا ہے جس کے اندر اسمِ اعظم کی روح پوری طرح موجود ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آسیہ نے جب یہ دعا کی تو اُس وقت موت سے پہلے اُس کو یہ تجربہ ہوا کہ فرشتوں نے اُس کو آخرت کی دنیا میں ملنے والا جنّتی مکان اُس کو دکھا دیا (القرطبی، جلد 18، صفحہ 203)۔

یہ بات یقینی ہے کہ آسیہ کی زبان سے یہ دعا اچانک یا اتفاقاً نہیں نکلی، بلکہ وہ اُس کی پچھلی زندگی کے دوران پیش آنے والے تجربات کا نتیجہ تھی۔ اِس دعا سے پہلے وہ ایک تیار شخصیت بن چکی تھی۔ وہ پہلے ہی سے ذکر اور دعا کے مخصوص لمحات میں جی رہی تھی۔ اِسی کا یہ نتیجہ تھا کہ جب فرعون کی سفّاکی کا معاملہ پیش آیا تو اُس کی زبان سے فطری طور پر مذکورہ قسم کے ربّانی الفاظ نکل پڑے۔

ایک تاریخی مثال

سلطان عبدالرحمٰن الناصر (وفات: 961ء) اسپین (اندلس) کا ایک مسلم حکمراں تھا۔ اُس نے

پچیس سال کی محنت سے قرطبہ کے پاس ایک شان دار محل بنایا۔ یہ محل چار میل لمبی اور تین میل چوڑی زمین میں واقع تھا۔ اس محل کا نام اس نے الزّہرا رکھا۔ مگر غیر معمولی طور پر بڑا ہونے کی وجہ سے اس کو قصر الزہرا کے بجائے مدینۃ الزہرا کہا جانے لگا۔

سلطان عبد الرحمٰن الناصر کو عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے الزّہرا کے نام سے یہ شاہی بستی بسائی اور اس میں شان دار محل تعمیر کیے۔ اِن تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان اتنا مشغول رہا کہ مسلسل تین جمعہ میں وہ مسجد نہ پہنچ سکا۔ چوتھے جمعہ کو جب سلطان جامع مسجد پہنچا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر (وفات: 966ء) نے جو خطبہ دیا، اُس میں نام لیے بغیر سلطان پر سخت تنقید کی گئی تھی۔

قاضی منذر نے ایسی آیتیں پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑی کرنے اور آخرت سے غافل ہو جانے پر وعیدیں تھیں۔ مثلاً— کیا تم ہر بلندی پر عبَث یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شان دار محل بناتے ہو گویا کہ تم کو ہمیشہ اِسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جبّارانہ حملہ کرتے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو (الشعراء: 131-128)۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو، یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ عمارت اُس کو لے کر جہنم کی آگ میں جا گری۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ اُن کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی، یہاں تک کہ اُن کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اور اللہ علیم اور حکیم ہے (التوبة: 110-109)۔

اِسی طرح قاضی منذر نے اِس مضمون کی بہت سی حدیثیں سنائیں اور ان کی تشریح کی۔ اپنے خطبے میں اگرچہ انھوں نے سلطان کا نام نہیں لیا، مگر مسجد کا ہر نمازی سمجھ رہا تھا کہ اِن سخت تنقیدوں کا مخاطب کون ہے اور وہ کس کے اوپر پڑ رہی ہیں۔

تنقید، یوں بھی آدمی کے اوپر بہت سخت ہوتی ہے اور جب مجمعِ عام میں کسی پر تنقید کی جائے تو وہ اور بھی زیادہ ناگواری کا باعث ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ تنقید ایک ماتحت کی زبان سے اپنے حاکم کے اوپر

تھی۔ اور جب کوئی حاکم اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس پر کبر کا سخت دَورہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے شریف اور دین دار لوگ بھی اُس وقت قابو سے باہر ہوجاتے ہیں، مگر سلطان نے حد درجہ ضبط سے کام لیا۔ اگر چہ سلطان پر اس تنقید کا بہت زیادہ اثر تھا، مگر وہ مسجد میں کچھ نہ بولا اور نماز کے بعد خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

گھر پہنچ کر سلطان نے اپنے لڑکے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو بہت سخت تکلیف دی۔ اب میں نے طے کرلیا ہے کہ میں اُن کے پیچھے کبھی جمعہ کی نماز نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے کہا: قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے، آپ اُن کو معزول کر دیجیے اور اُن کی جگہ دوسرا کوئی امام مقرر کردیجیے، جو ایسی گستاخی نہ کرے۔ یہ سن کر سلطان غصے میں آ گیا۔ اُس نے اپنے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا: تمھارا بُرا ہو، ایک شخص جو ہدایت سے دور ہے اور راستے سے بھٹکا ہوا ہے، کیا اُس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے آدمی کو معزول کر دیا جائے گا۔ یہ بات کبھی نہیں ہوسکتی (**هذا ما لا يكون**)۔

مجھے اُن کی باتوں سے چوٹ لگی، اِس لیے میں نے اُن کے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھالی۔ میری خواہش ہے کہ اِس قسم کے کفّارے کی کوئی صورت نکل آئے۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے (**بل يصلّي بالناس حياتنا وحياته إن شاء الله تعالىٰ**)، چناں چہ قاضی منذر بدستور جمعہ کی نماز پڑھاتے رہے۔ عبدالرحمٰن الناصر کے انتقال کے بعد اُس کے لڑکے نے بھی اُن کے مقام کو اُسی طرح باقی رکھا۔

اوپر جس واقعے کا ذکر ہوا، اُس میں بہت بڑا اسبق ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کی وہ مطلوب صفات کیا ہیں، جو اگر کسی کے اندر ہوں تو اُس کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوتی ہے کہ وہ خدا سے ایسی دعا کر سکے جس کو اسمِ اعظم کے ساتھ کی جانے والی دعا کہا جاتا ہے۔

اسمِ اعظم کے ساتھ دعا میں اگر پچاس فی صد اسمِ اعظم کا حصہ ہے تو پچاس فی صد خود دعا کرنے والے کی ربّانی استعداد کا حصہ ہے۔ یہ ربّانی استعداد قاضی منذر اور سلطان عبدالرحمٰن دونوں کے اندر

کم وبیش موجود تھی، اِس لیے اُن کے ساتھ ایک عظیم دعا کی تاریخ شامل ہوگئی۔ حسب ذیل واقعہ اِس معاملے میں ایک چشم کُشا مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

بارش شروع ہوگئی

سلطان عبد الرحمٰن الناصر کے زمانے میں ایک بار اسپین میں قحط پڑا۔ بہت سخت حالات پیدا ہوگئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ استسقاء کی نماز پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے۔ قاضی منذر نے سلطان کے قاصد سے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے مگر وہ خود کیا کر رہے ہیں۔

قاصد نے کہا: آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مٹی کے فرش پر سجدے میں گرے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے اور اللہ سے کہہ رہے تھے: خدایا، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا، حالاں کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (**هذه ناصيتي بيدک، أتراک تعذِّب بیَ الرّعيّة، وأنت أرحم الراحمين**)

یہ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان ظاہر ہوگیا۔ انھوں نے قاصد سے کہا: اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ، اب ضرور بارش ہوگی۔ کیوں کہ زمین کا حاکم جب تضرع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (**إذا خشع جبّار الأرض، رحم جبّار السماء**) چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ قاصد واپس ہو کر گھر پہنچا تھا کہ بارش شروع ہوگئی (**الكامل فی التاريخ**، جلد 8، صفحہ 675)۔

زمین پر خشک سالی اِس لیے آتی ہے، تاکہ آنکھوں کی خشک سالی ختم ہو۔ آسمان پر بادل اِس لیے گرجتے ہیں، تاکہ لوگوں کے دل خدا کے خوف سے دہلیں۔ گرمی کی شدت اِس لیے ہوتی ہے، تاکہ لوگ جہنم کی آگ کو یاد کر کے تڑپ اٹھیں۔

اِس طرح کے واقعات کا نہایت گہرا تعلق، اسماءِ حسنیٰ اور اسمِ اعظم کے معاملے سے ہے۔ یہی

وہ واقعات ہیں جو انسان کے اندر ربّانی کیفیات کی پرورش کرتے ہیں، اور جس سینے کے اندر ربّانی کیفیات کا یہ چشمہ جاری ہوجائے، وہی وہ انسان ہے جس کو اسماءِ حسنیٰ کی معرفت ہوتی ہے اور اُسی کو یہ توفیق ملتی ہے کہ وہ اسمِ اعظم کے ساتھ خداوندِ عالم کو پکارے اور اُس کی پکار ضرور سنی جائے۔

ذاتی تجربات

خدا کے فضل سے مجھ کو اِس قسم کے تجربے بار بار پیش آئے ہیں۔ 30 دسمبر 2006 کو میں اپنی ٹیم (سی پی ایس) کے کچھ افراد کے ساتھ نئی دہلی کے لودھی گارڈن میں گیا۔ یہ گویا کہ ہماری اسپریچول آؤٹنگ (spiritual outing) تھی۔ اِس موقع پر میرے دل سے ایک دعا نکلی، جو میری فہم کے مطابق، اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کی ایک مثال ہے۔

جب ہم لوگ لودھی گارڈن کے اندر پہنچ گیے تو میں نے اپنی ٹیم کے افراد سے پوچھا کہ آپ لوگ جب یہاں پہنچے تو آپ کا پہلا احساس کیا تھا۔ لوگوں نے مختلف انداز سے اپنے اپنے تجربے بتائے۔ پھر میں نے کہا کہ جب میں اِس خوب صورت گارڈن کے اندر داخل ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں جنت کو دور سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ خوب صورت گارڈن میرے لیے جنت کا ایک بعید تعارف بن گیا۔

میں نے اشک بار آنسوؤں کے ساتھ کہا کہ خدایا، تو نے مجھے ناقص جنت میں پہنچا دیا، اب تو اپنی رحمت سے مجھے کامل جنت میں بھی داخل کردے۔ میں نے کہا کہ خدایا، میں اور میرے ساتھی، پوری انسانی تاریخ میں، جنت کے لیے سب سے زیادہ غیر مستحق لوگ (least deseving candidates) ہیں۔ اگر تو ہمارے کامل عدم استحقاق کے باوجود ہم کو اپنی جنت میں داخل کردے تو یہ واقعہ تیری شانِ رحمت کے ایک نیے اظہار کے ہم معنیٰ ہوگا۔ سارے زمین اور آسمان اور تمام فرشتے یہ دیکھ کر حیران ہوجائیں گے کہ خدا کی رحمتوں کا سمندر اتنا وسیع تھا کہ ہمارے جیسے آخری حد تک غیر مستحق افراد بھی تیری رحمتِ بے پایاں کے فیض سے محروم نہ رہے، تیری رحمتِ بے پایاں کتنی وسیع تھی کہ وہ تاریخ کے اِن نااہل ترین افراد تک کا احاطہ کر رہی تھی۔

لقد أُوتيتَ سُؤلك يا موسیٰ

غالبًا 1962 کی بات ہے۔ مجھے اعظم گڑھ کے ایک قصبہ (اَن جان شہید) کے ایک اجتماع میں شرکت کا موقع ملا۔ اِس اجتماع میں مسلم حضرات شریک تھے۔ مجھے پیشگی طور پر معلوم نہ تھا کہ مجھ کو اِس اجتماع میں خطاب کرنا ہے۔ کچھ لوگوں نے اچانک مجھے اسٹیج پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ میرے لیے یہ ایک مجبورانہ خطاب کا معاملہ تھا۔ یہ غالبًا پہلا موقع تھا جب کہ مجھے خطاب کے معاملے میں کامل عجز کا تجربہ ہوا۔ اس سے پہلے میں نے بار بار اجتماعات میں خطاب کیا تھا، مگر یہ تمام خطابات تحریری مقالے کی صورت میں تھے۔ مجھے پیشگی طور پر پروگرام کا علم ہوتا تھا اور میں مقالہ لکھ کر اس کو وہاں پڑھ دیتا تھا۔

مگر اِس بار ایسی صورت پیش آئی کہ مجھے لازمی طور پر بولنا بھی تھا اور کسی پیشگی تیاری کے بغیر زبانی طور پر خطاب کرنا تھا۔ اُس وقت اچانک میرے اندر وہ ذہنی بھونچال کی کیفیت پیدا ہوئی جس کو نفسیاتی اصطلاح میں برین اسٹارمنگ (brain storming) کہا جاتا ہے۔ اُس وقت میرے لیے کسی آزادانہ انتخاب کا موقع نہ تھا۔

میں نے خدا کو یاد کیا اور دیوانگی کے عالم میں اچانک بولنا شروع کر دیا۔ حاضرین کے سامنے مائک پر بولتے ہوئے میں نے کہا کہ — قرآن میں پیغمبروں کے قصے بتائے گئے ہیں، لیکن یہ تاریخی کہانی کے طور پر نہیں، بلکہ وہ ہمارے حال کے لیے ایک زندہ سبق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِسی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ وہ مصر کے جابر بادشاہ کے دربار میں جائیں اور وہاں اُس کے سامنے توحید کی دعوت پیش کریں۔

حضرت موسیٰ نے کہا کہ: **يضيق صدری ولاينطلق لساني**۔ خدایا، میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان چلتی نہیں (**الشعراء**: 13)۔ پھر انھوں نے قادرِ مطلق خدا کی توفیق سے یہ دعا کی کہ: **ربّ اشرح لی صدری، ویسّرلی أمری، واحلُل عُقدةً من لسانی، یفقهوا قولی** (اے میرے رب، میرے لیے میرا سینہ کھول دے اور میرے لیے میرے معاملے کو آسان کر دے۔ اور تو میری زبان کی گرہ کو کھول دے تا کہ لوگ میری بات کو سمجھیں (طٰہٰ: 28-25)

میں نے کہا کہ حضرت موسیٰ نے جب اس طرح خدائے سمیع وبصیر کو پکارا تو ان کی دعا سیدھے عرشِ الٰہی تک پہنچ گئی اور وہاں سے آواز آئی: لقد أوتیت سؤلک یا موسیٰ۔ یعنی اے موسیٰ، تم نے جو سوال کیا، وہ تم کو دے دیا گیا (طٰہٰ: 36)۔

اس کے بعد میں نے دیوانگی کے عالم میں کہا کہ یہ واقعہ کوئی ماضی کی سرگزشت نہیں، یہ واقعہ آج بھی اسی طرح زندہ ہے، جس طرح خدائے حی وقیوم زندہ موجود ہے۔ آج بھی اگر کوئی خدا کا بندہ خدا کو پکارے اور کہے کہ خدایا، میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان چلتی نہیں تو آج بھی اُس کی یہ آواز خدائے سمیع وبصیر تک پہنچے گی اور وہاں سے آواز آئے گی کہ اے میرے بندے، تم نے جو سوال کیا وہ تم کو دے دیا گیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا اور میری آنکھ سے آنسو نہ تھمنے والے مینھ کی طرح برس رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے بے اختیارانہ انداز میں بولنا شروع کیا اور مسلسل بولتا رہا۔

یہ واقعہ میرے لیے اِس معاملے میں ایک بریک تھرو (breakthorugh) کی مانند تھا۔ اس کے بعد میں نے تقریری مقالہ لکھنا چھوڑ دیا اور برجستہ انداز میں بولنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں نے انڈیا کے اندر اور انڈیا کے باہر سیکڑوں اجتماعات میں شرکت کی اور لمبی لمبی تقریریں کیں۔ یہ بلاشبہہ اَن جان شہید کے اجتماع والی دعا کا کرشمہ تھا۔

میری سمجھ کے مطابق، یہ دعا اسم اعظم کے ساتھ کی ہوئی دعا تھی۔ اس سے پہلے میں گویا ایک بے زبان انسان تھا۔ میرے مرحوم عزیز مولانا اقبال احمد سہیل (وفات: 1955) مجھ کو بچپن میں ''مرزا پھویا'' کہا کرتے تھے۔ مذکورہ واقعے کے بعد میں جس طرح اجتماعات میں بولنے لگا، اُس کی کوئی بھی توجیہہ دعا کے سوا نہیں کی جاسکتی۔

تو میرے لیے پلے بیک اسپیکر بن جا

ایک بار میں ایک مغربی ملک کے سفر پر تھا۔ اِس دوران مجھے ایک اجتماع میں خطاب کے لیے بلایا گیا۔ بلانے والے نے مجھ سے یہ نہیں بتایا تھا کہ مجمع کی نوعیت کیا ہوگی، اس نے صرف یہ بتایا تھا کہ یہ پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع ہوگا۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر میرے ذہن میں یہ آ گیا کہ وہاں ہندستان اور

پاکستان کے لوگ ہوں گے اور مجھے وہاں اردو میں خطاب کرنا ہوگا۔

یہ رات کا وقت تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک صاف ستھرے ہال میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ دریافت کرنے پر مجھے بتایا گیا کہ یہ سب انگریزی داں لوگ ہیں۔ ان کو مجھے انگریزی میں خطاب کرنا ہے، کیوں کہ وہ لوگ اردو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ خبر میرے لیے ایسی تھی جیسے کسی کے اوپر اچانک بجلی گر جائے۔ اس سے پہلے میں نے انگریزی زبان میں پیشگی طور پر تیار کیے ہوئے مقالے پڑھے تھے، لیکن برجستہ طور پر انگریزی میں میں نے کبھی خطاب نہیں کیا تھا۔

ہال کے ساتھ وہاں ایک سائڈ روم تھا۔ میں سراسیمگی کے عالم میں اس سائڈ روم میں گیا۔ میں نے اندر سے دروازے کو بند کرلیا۔ اور وضو کرکے دو رکعت صلوٰۃ الحاجت پڑھی۔ اس کے بعد میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو میری آنکھوں سے آنسو اِس طرح بہہ رہے تھے جیسے کہ پانی کا نل کھل گیا ہو۔

میں نے روتے ہوئے کہا کہ خدایا، یہاں ایک عاجزِ مطلق کو قادرِ مطلق کی ترجمانی کرنی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو پتھروں کو حکم دیں اور وہ چلا کر آپ کی بات کا اعلان کریں۔ آپ اگر حکم دیں تو درخت اپنی خاموشی کو توڑ کر انسانوں سے خطاب کریں۔ اگر آپ حکم دیں تو زمین اور آسمان، وہ سب کچھ بولیں جو انسان کو بولنا تھا، مگر وہ نہ بول سکا۔ لیکن خدایا، آپ خود اپنے قانونِ امتحان کی بنا پر ایسا نہیں کر سکتے۔ اِس لیے آپ کے سامنے اس کے سوا کوئی اور انتخاب نہیں کہ آپ میرے جیسے عاجز انسان کی وہ مدد کریں جو اس سے پہلے آپ نے کسی اور کی نہیں کی۔

خدایا، میں آپ کے تمام اسماءِ حسنیٰ کا واسطہ دے کر آپ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ میرے لیے پلے بیک اسپیکر (playback speaker) بن جائیں۔ آپ بولتے جائیں اور میں اس کو دہراتا جاؤں۔ آپ خاموشی کی زبان میں مجھ کو بتائیں اور میں نُطق کی زبان میں اس کو دوسروں کے سامنے پیش کروں۔ خدایا، اگر میں اِس موقع پر نہ بولوں تو یہ میرے لیے 'فرار من الزَّحف' کے ہم معنیٰ ہوگا۔ اور اگر آپ میری مدد نہ کریں تو اُس بات کا اعلان نہ ہو سکے گا جس کا اعلان آپ کی سب سے زیادہ مطلوب چیز ہے۔ خدایا، یہ وہ لمحہ ہے جب کہ نہ میرے لے کوئی دوسرا انتخاب ہے اور نہ آپ کے لیے کوئی دوسرا

انتخاب۔ خدایا، یہ وہ لمحہ ہے جب کہ بندے کا عجز اور خالق کی قدرت دونوں ایک سطح پر آگیے ہیں۔ ایسی صورت میں نہ میرے لیے واپسی کا موقع ہے اور نہ آپ کے لیے مجھ کو نظر انداز کرنے کا موقع۔

یہ دعا کرکے میں باہر آیا اور ہال کے اندر مقرر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پورا ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں صرف مجھ کو تقریر کرنا تھا۔ میں نے دیوانگی کے عالم میں بولنا شروع کیا۔ اور تقریباً ایک گھنٹے تک انگریزی میں بولتا رہا۔ میں نے پوری تقریر برجستہ طور پر اور روانی کے ساتھ کی۔ تقریر کے خاتمے پر اعلان کیا گیا کہ کوئی صاحب سوال کرنا چاہیں تو سوال کر سکتے ہیں، لیکن مجمع کی طرف سے کوئی سوال نہ آیا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ تمام لوگ آپ کی انگریزی تقریر سے اِس قدر مسحور تھے کہ وہ اپنے اندر سوال کرنے کی جرأت نہ پا سکے۔

اِس تجربے کے بعد میری زندگی میں غیر متوقع طور پر ایک نیا دَور آیا، جب کہ میں برجستہ طور پر انگریزی زبان میں بولنے لگا۔ انگریزی میں گفتگو، انگریزی میں انٹرویو، انگریزی میں تقریر۔ یہ سب جو اِس سے پہلے میری زندگی میں موجود نہ تھا، اب وہ عمومی طور پر میری زندگی میں شامل ہوگیا اور بفضلہٖ تعالیٰ تادمِ تحریر (30 اگست 2007) جاری ہے۔

آزادیٔ ہند (1947) کے بعد جب میں نے خصوصی طور پر انگریزی سیکھنا شروع کیا تو ہر ایک میری حوصلہ شکنی کرتا تھا۔ میرے بڑے بھائی (عبدالعزیز خاں) نے میرے انگریزی شوق کو دیکھ کر کہا تھا: بڈھا طوطا کیا پڑھے گا۔ عام تجربے کے لحاظ سے، اُن کا ایسا کہنا بالکل درست تھا۔ لیکن خدا کی نصرت سے وہ سب کچھ ہوسکتا ہے جو انسان سے نہیں ہوسکتا۔ میرے گمان کے مطابق، مذکورہ دعا بلاشبہہ، اسمِ اعظم کے ساتھ کی جانے والی دعا تھی اور اِسی دعا کا یہ کرشمہ تھا کہ ایک نہ ہونے والی بات واقعہ بن کر لوگوں کے سامنے آگئی۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

پروفیسر محمد مجیب (وفات: 1985) جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے تین بڑے ستونوں میں سے ایک تھے۔ بقیہ دو یہ تھے: ڈاکٹر ذاکر حسین (وفات: 1969)، ڈاکٹر عابد حسین (وفات: 1978)۔

پروفیسر مجیب نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اُن کو انگریزی زبان پر غیر معمولی قدرت تھی۔ انھوں نے مستشرقین (orientalists) کا لٹریچر تفصیل کے ساتھ پڑھا تھا۔

غالبًا 1970 کی بات ہے۔ میں جامعہ ملیہ کے کیمپس میں پروفیسر مجیب سے ملا۔ اُس وقت پروفیسر انوار علی خاں سوز (وفات: 1987) بھی میرے ساتھ تھے۔ گفتگو کے دوران پروفیسر مجیب نے خاص انداز میں مجھ سے کہا: مولوی صاحب، آپ جانتے ہیں کہ اِس زمانے میں اسلام کی نمائندگی یہودی اسکالر کر رہے ہیں۔

اُن کا مطلب یہ تھا کہ موجودہ زمانے میں ایک نیا اسلوبِ تحریر پیدا ہوا ہے۔ اِس اسلوبِ تحریر میں، مسلم علما اسلامی لٹریچر تیار نہ کرسکے۔ البتہ تعلیم یافتہ یہودیوں نے یہ کام کیا۔ انھوں نے وقت کے جدید اسلوب میں اسلام کے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ اِن کتابوں میں اگر چہ اسلام کی تعلیمات کو بگڑی ہوئی صورت میں پیش کیا گیا ہے، لیکن اسلوبِ تحریر کے اعتبار سے وہ وقت کے اسلوب میں ہیں۔ اس لیے آج جو تعلیم یافتہ لوگ انگریزی زبان میں اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، وہ اکثر اِنھیں یہودی علما کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

میں پروفیسر مجیب کی باتوں کو سنتا رہا۔ میں نے ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، لیکن اُن کی بات کو سن کر میرے دماغ میں ایک بھونچال آگیا۔ میں خاموشی کے ساتھ واپس آگیا اور پھر رات دن یہ دعا کرنے لگا کہ خدایا، مجھے توفیق دیجیے کہ میں آپ کے دین کو آج کے اسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کرسکوں، میں عصری اسلوب میں اسلام کا لٹریچر تیار کرسکوں۔

میں اکثر کسی واقعے کا حوالہ دے کر دعا کرتا ہوں۔ اِس معاملے میں بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ اصل یہ ہے کہ آزادی کے بعد یوپی میں خاتمۂ زمین داری کا قانون (zamindari abolition act) نافذ ہوا۔ نیشنل گورنمنٹ کے تحت، یہ قانون اِس اصول پر مبنی تھا کہ — جو جوتے، اُس کا کھیت۔

میرا خاندان یوپی کے اعظم گڑھ سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمارا خاندان وہاں کے بڑے زمین داروں میں سے ایک تھا۔ ہماری زمینیں زیادہ تر کسانوں کو دی ہوئی تھیں، جو اُن کو جوتتے تھے اور لگان ادا کرتے

تھے۔ خاتمۂ زمیں داری کے قانون کے مطابق، زمین دار کو اُس کی زمین واپس ملنے کی صرف ایک ہی صورت تھی، وہ یہ کہ زمین کو جوتنے والا کسان تحریری طور پر زمین سے استعفا دے دے۔

ہماری بیش تر زمینیں کسانوں کے پاس تھیں۔ یہ کسان سب کے سب ہندو لوگ تھے۔ ہماری زمیں داری کے مینیجر بھی ایک ہندو تھے، جن کا نام بھاؤرام تھا۔ بھاؤرام ہمارے خاندان کے نہایت وفادار ملازم تھے۔ انھوں نے ایک طوفانی مہم چلادی کہ تمام کسان جو ہماری زمینوں کو جوتتے ہوئے تھے، وہ تحریری استعفا دے دیں۔ بھاؤرام نے اپنی رات دن کی کوشش سے ایک ایک کسان سے استعفا لکھوا لیا۔ ہمارے ساتھ استثنائی طور پر ایسا ہوا کہ ہمارا کوئی بھی کھیت ایسا نہ بچا جس کا تحریری استعفا حاصل نہ کرلیا گیا ہو۔

اُس زمانے میں بھاؤرام پر ایک دیوانگی طاری تھی۔ وہ ہم لوگوں سے کہتے تھے کہ: بابو، جم داری میں داگ نہ لگنے پائے (بابو، زمیں داری میں داغ نہ لگنے پائے) میں اِس واقعے کے حوالے سے خدا سے دعا کرنے لگا۔ میں روتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ خدایا، تیرے دین میں ایک داغ لگ رہا ہے۔ تیرا دین اُس اسلوب میں پیش نہیں ہو رہا ہے جو آج کے جدید ذہن کو ایڈریس کرسکے۔ تو مجھے توفیق دے کہ میں تیرے دین کے اِس داغ کو ہٹاؤں، میں وقت کے اسلوب میں اسلام کو پیش کرسکوں۔ میں بے قرار دل اور اشک بار آنسوؤں کے ساتھ یہ دعا کرتا تھا اور رات دن اپنی تیاری میں مشغول رہتا تھا۔

اُس زمانے میں میری بے قراری کا عالم یہ تھا کہ ایک بار میں دلّی پبلک لائبریری میں گیا۔ وہاں کے ریفرنس سیکشن میں جا کر ریفرنس کی کتابوں کو پڑھنے لگا۔ اُس وقت میری محویت کا یہ عالم تھا کہ میں قریب کی کرسی پر نہ بیٹھ سکا۔ میں الماری کے سامنے کھڑا تھا اور کتابیں نکال نکال کر پڑھ رہا تھا۔ یہ سخت سردی کا زمانہ تھا۔ چناں چہ مجھے سردی لگ گئی اور میں بیمار ہو کر تقریباً دو مہینے تک بستر پر پڑا رہا۔

آج جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے خدا کی توفیق سے تقریباً ہر اسلامی موضوع پر اتنی کتابیں لکھی ہیں، جو ایک تعلیم یافتہ انسان کے لیے وقت کے اسلوب میں

اسلام کا مؤثر تعارف پیش کرتی ہیں۔ مشرق اور مغرب دونوں جگہ کے اہلِ علم نے اِس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

لوگوں کا یہ تاثر یہاں تک پہنچا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں نے میرے لٹریچر کو پھیلانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی ہیں۔ امریکا میں مقیم کچھ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنے ذاتی جذبے کے تحت، میری تمام کتابوں اور ماہ نامہ الرسالہ کو انٹرنیٹ کے ویب سائٹ پر ڈال دیا ہے۔ اب دنیا کے کسی بھی حصے میں کوئی آدمی میری تحریروں کو اردو اور انگریزی میں انٹرنیٹ کی مدد سے پڑھ سکتا ہے۔

اِسی طرح مصر کے کچھ عرب حضرات میری کتابوں کو انٹرنیٹ پر ڈال رہے ہیں۔ ان شاء اللہ، اب ہر جگہ میری عربی کتابیں بھی انٹرنیٹ کی مدد سے پڑھی جاسکیں گی۔ اِس کے علاوہ، انڈیا میں ایک پوری ٹیم نے اپنے آپ کو اِس مشن کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اِس طرح یہ کام اب ہر دن عالمی سطح پر پھیل رہا ہے۔ اسی طرح کچھ تعلیم یافتہ لوگوں نے اِس لٹریچر کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ انھوں نے محض ذاتی جذبے کے تحت، میری اردو اور انگریزی تقریروں کو ٹی وی کے پروگرام میں شامل کردیا۔ **فجزاهم الله خيرا الجزاء۔**

''عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر'' کا وجود میں آنا بلاشبہہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ میرے جیسے عاجز اور بے حقیقت آدمی کے ذریعے یہ واقعہ پیش آیا۔ اِس واقعے کی اِس کے سوا کوئی اور توجیہہ ممکن نہیں کہ اسمِ اعظم کے دعا جو میرے بے قرار دل سے نکلی، اُس کو خدا نے قبول فرمایا اور اِس طرح اسلام کے جدید تعارف کا وہ واقعہ پیش آیا جو میرے جیسے انسان کے لیے ناقابلِ تصور تھا۔

ایک واقعہ

24 اکتوبر 2005 کا واقعہ ہے۔ یہ عید کا دن تھا۔ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ نئی دہلی کی ایک مسجد میں عید کی نماز ادا کرنے گیا۔ وہاں میں مسجد کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ میں مسلسل رو رہا تھا اور بے قراری کے عالم میں دل کی زبان سے دعا کر رہا تھا۔ میری اِس حالت کو مولانا محمد ذکوان ندوی نے دیکھا۔

بعد کوانھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا کیا معاملہ تھا۔اُن کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ مجھے وہ حدیث یاد آئی،جس میں عید الفطر کے دن نماز کے لیے نکلنے والے اہلِ ایمان کا ذِکر ہے۔وہ حدیث اِس طرح ہے:

"...... فإذا كان يومُ عيدِهم، يعني يومَ فِطرهم، باهىٰ بهم ملائكتَه، فقال: ملائكتي، ماجزاءُ أجيرٍ وفّىٰ عملَه. قالوا: ربّنا، جزائُه أن يُوفّىٰ أجره.قال: ملائكتي، عبيدي وإمائي قضوا فريضتي عليهم، ثمّ خرجوا يعُجُّون إلى الدّعاء، وعزّتي وجَلالِي وكَرمي وعُلوّي وارتفاعِ مكاني لأجيبنّهُم. فيقول: ارجعوا فقد غفرتُ لكم، وبدّلتُ سيّئاتكم حسنات. قال: فيرجعون مغفوراً لهم. (رواه البيهقي في شعب الإيمان؛ مشكاة المصابيح، رقم الحديث: 2096)۔

ترجمہ: جب اُن کی عید کا دن آتا ہے،یعنی عید فطر کا دن،تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے اُن پر فخر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: اے میرے فرشتو، اُس عامل کا اجر کیا ہے جس نے اپنے عمل کو پورا کردیا۔ فرشتے کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، اُس کی جزا یہ ہے کہ اُس کو اُس کے عمل کا پورا بدلہ دے دیا جائے۔خدا کہتا ہے کہ اے میرے فرشتو، میرے بندوں اور میری بندیوں نے میرے اُس فرض کو ادا کردیا جو اُن پر تھا، پھر وہ نکلے ہیں دعا کے ساتھ مجھ کو پکارتے ہوئے۔میری عزت اور میرے جلال کی قسم، میرے کرم، میرے عُلوِ شان اور میرے بلند مقام کی قسم، میں ضرور اُن کی پکار کو سنوں گا۔ پھر خدا کہتا ہے کہ: تم لوگ واپس جاؤ، میں نے تم کو بخش دیا اور میں نے تمھارے سیّأت کو حسنات میں بدل دیا۔پس وہ لوگ اِس طرح لوٹتے ہیں کہ اُن کی مغفرت ہوچکی ہوتی ہے۔

آج کے دن کی نسبت سے یہ حدیث مجھے یاد آئی۔ یہ سوچ کر میرا دل بے قرار ہوگیا کہ آج کے دن خدا لوگوں کو بڑے بڑے انعام دے رہا ہے، لیکن یہ انعام عمل کرنے والوں کے لیے ہے اور میرے پاس کوئی عمل نہیں۔

پھر مجھ کو سر سید احمد خاں (وفات: 1898) کا ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ اپنے محمڈن کالج (موجودہ علی گڑھ یونیورسٹی) کے چندے کے لیے ایک مسلم نواب کے یہاں گیے۔نواب صاحب

سر سید کے بعض خیالات پر ان سے بہت غصہ تھے۔ انھوں نے سر سید سے ملنے سے انکار کر دیا، مگر سر سید مایوس نہیں ہوئے۔ ان کو معلوم تھا کہ شام کو نواب صاحب اپنی گھوڑا گاڑی پر سیر کے لیے نکلتے ہیں۔ اُس وقت ان کی کوٹھی کے سامنے بھکاری لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔ نواب صاحب ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتے ہوئے آگے چلے جاتے ہیں۔

سر سید شام کے وقت وہاں پہنچے اور بھکاریوں کی صف میں اِس طرح بیٹھ گیے کہ اپنی ٹوپی کو کاسۂ گدائی کی طرح اپنے سامنے رکھ لیا۔ نواب صاحب حسب معمول اپنی گھوڑا گاڑی پر نکلے۔ انھوں نے دیکھا کہ سر سید بھکاریوں کی صف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر نواب صاحب کو تعجب ہوا۔ انھوں نے کہا کہ سید تم یہاں کہاں۔ سر سید نے جواب دیا کہ — نواب صاحب، اگر آپ مجھے چندہ نہیں دے سکتے تو بھیک تو دے سکتے ہیں۔ اس بات کا نواب صاحب پر بہت اثر پڑا۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر پڑے اور سر سید کو لے کر اپنی کوٹھی کے اندر گیے۔ ان کو عزت کے ساتھ بٹھایا اور ان کو کالج کے لیے کافی چندہ دیا۔

میں نے اس واقعے کو لے کر کہا کہ خدایا، اگر میں عمل کی بنیاد پر کچھ پانے کا مستحق نہیں تو بھیک کے طور پر تو مجھے اپنا انعام عطا کر دے، کیوں کہ تو نے قرآن میں جس طرح عامل کو عطیہ کا مستحق قرار دیا ہے، اِسی طرح تو نے سائل کو بھی عطیہ کا مستحق بتایا ہے۔ اگر تو انسان سے یہ چاہتا ہے کہ وہ عامل کو دینے کے ساتھ سائل کو بھی دے تو یقیناً میں امید کر سکتا ہوں کہ تو خود بھی میرے ساتھ اِسی طرح کا معاملہ فرمائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کی ایک مثال ہے، جس کی توفیق مجھے خدا کی خصوصی رحمت کے تحت حاصل ہوئی۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے، اسمِ اعظم کے ساتھ دعا نہ تو کسی یاد کیے ہوئے الفاظ کو دہرانے کا نام ہے اور نہ خود انسان پیشگی طور پر سوچ کر اِس قسم کی دعا کر سکتا ہے۔ اِس قسم کی دعا براہِ راست خدا کی توفیق سے ہوتی ہے اور وہ اچانک ہی انسان کے سینے سے اُبل پڑتی ہے، جیسے کوئی جوالہ مُکھی پہاڑ اچانک پھٹ پڑے، حالاں کہ موسمیات کے ماہرین نے اس کی پیشین گوئی نہ کی ہو۔

ننانوے اسماءِ حسنیٰ

1 - اللّٰه   2 -الرّحمٰن   3 - الرّحيم   4 -الملِك   5 -القدّوس
6 -السّلام   7 -المؤمن   8 -المُهَيمن   9 -العزيز   10 -الجبّار
11 -المتكبّر   12 -الخالق   13 -البارئ   14 -المصوّر   15 -الغفّار
16 -القهّار   17 -الوهّاب   18 -الرزّاق   19 -الفتّاح   20 -العليم
21 -القابض   22 -الباسط   23 -الخافض   24 -الرّافع   25 -المُعِزّ
26 -المُذِلّ   27 -السّميع   28 -البصير   29 -الحَكَم   30 -العدْل
31 -اللطيف   32 -الخبير   33 -الحليم   34 -العظيم   35 -الغفور
36 -الشكور   37 -العلي   38 -الكبير   39 -الحفيظ   40 -المُقيت
41 -الحسيب   42 -الجليل   43 -الكريم   44 -الرّقيب   45 -المجيب
46 -الواسع   47 -الحكيم   48 -الودود   49 -المجيد   50 -الباعث
51 -الشهيد   52 -الحق   53 -الوكيل   54 -القوىّ   55 -المتين
56 -الوليّ   57 -الحميد   58 -المُحصي   59 -المُبدئ   60 -المعيد
61 -المحيى   62 -المُميت   63 -الحيّ   64 -القيّوم   65 -الواجد
66 -الماجد   67 -الواحد   68 -الصّمد   69 -القادر   70 -المقتدر
71 -المقدّم   72 -المؤخّر   73 -الأوّل   74 -الاٰخِر   75 -الظاهر
76 -الباطن   77 -الوالي   78 -المتعالي   79 -البَرّ   80 -التّواب
81 -المُنتقِم   82 -العفُوّ   83 -الرّءُوف   84 -مالك المُلك
85 -ذُوالجلال والإكرام   86 -المُقسِط   87 -الجامع   88 -الغنيّ
89 -المُغني   90 -المانع   91 -الضّارّ   92 -النّافع   93 -النّور
94 -الهادي   95 -البديع   96 -الباقي   97 -الوارث   98 -الرّشيد
99 -الصّبور (فتح الباري بشرح صحيح البخاري، جلد11، صفحہ 220)۔